گوجرانوالہ کی شعری روایت اور شہزاد نیّر کی شاعری

یہ مقالہ

حفصہ طاہرہ

رول نمبر:02، سیشن:21۔2019 بہار نے برائے حصول ڈگری ایم فل اُردو

منہاج یونیورسٹی لاہور (پاکستان) میں پیش کیا

یہ تحقیقی کام، زیر نگرانی

ڈاکٹر مظفر عباس، مکمل ہوا۔

انتساب

اپنی دادی جان کے نام جن کی دعاؤں سے

میں آج کامیاب ہوں۔ پھوپھو عفیفہ طاہرہ

اور میمونہ طاہرہ کے نام

اقرارنامہ

میں حفصہ طاہرہ اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ میرے اس مقالہ میں کسی قسم کا سرقہ نہیں پایا جاتا۔ یہ میری ذاتی کاوش اور محنت پر مبنی ہے نیز ادبی جہات میں قبل اس کے "گوجرانوالہ کی شعری روایت اور شہزاد نیّر کی شاعری" پر کوئی کام نہیں ہوا۔ یہ مقالہ منہاج یونیورسٹی ڈاکٹر مظفر عباس کی زیرِ نگرانی لکھا گیا ہے۔ میں حلفاً اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ اس سے قبل یہ مقالہ حصولِ سند کے لیے کسی اور یونیورسٹی یا ادارہ میں نہیں دیا گیا اور نہ ہی آئندہ دیا جائے گا۔

حفصہ طاہرہ

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ متعلمہ حفصہ طاہر ایم فل شعبہ اردو، منہاج یونیورسٹی لاہور میں ریگولر پروگرام کے تحت ایم فل اردو کی سند کے لیے "گوجرانوالہ کی شعری روایت اور شہزاد نیّر کی شاعری" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ یہ مقالہ میری نگرانی میں مکمل ہوا ہے۔ میں نے اس مقالے کو غور سے پڑا ہے یہ مقالہ ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے یونیورسٹی میں مروجہ طریقہ کار کے مطابق ایم فل کی سند کی خاطر جانچ کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے چنانچہ یہ مقالہ سپرد جامعہ کیا جاتا ہے۔

دستخط:

نام نگران مقالہ: ڈاکٹر مظفر عباس

Plagiarism Undertaking

I hereby solemnly declare that research work presented in the thesis titled گوجرانوالہ کی شعری روایت اور شہزاد نیّر کی شاعری is solely my research work with no significant contribution from any other person. Small contribution/help wherever taken has been duly acknowledged and that complete thesis has been written by me.

I understand the zero tolerance policy of the HEC and Minhaj University Near Hamdard Chowk, Township, Lahore towards plagiarism. Therefore, I as an Author of the above titled thesis declare that no portion of my thesis has been plagiarized and any material used as reference s properly referred/cited.

I undertake that if I am found guilty of any formal plagiarism in the above titled thesis even after award of M.Phil degree, the University reserves the rights to withdraw/revoke my M.Phil degree and the HEC and the University has the right to publish my name on the HEC/University Website on which names of students are placed who submitted plagiarized thesis.

Student/Author Signature_____

Name_____

Certificate of Approval

This is to certify that the research work presented in this thesis, entitled گوجرانوالہ کی شعری روایت اور شہزاد نیّر کی شاعری was conducted by حفصہ طاہرہ under the supervision of. ڈاکٹر مظفر عباس No part of this thesis has been submitted anywhere else for any other degree. This thesis is submitted to the Urdu Department Minhaj University, Hamdard Chowk, Township, Lahore in partial fulfillment of requirements for the degree of Master of Philosophy in field of Urdu Department of Minhaj University Near HamdardChowk, Township, Lahore.

Student Name: _____ Signature_____

Examination Committee:

a) External Examiner 1: Name _____ Signature_____

Designation & Office Address_____

b) External Examiner 1: Name _____ Signature_____

Designation & Office Address_____

c) External Examiner 1: Name _____ Signature_____

Designation & Office Address_____

Supervisor Name: _____ Signature_____

Name of HOD _____ Signature_____

Author's Declaration

I hereby state that my M.Phil thesis titled گوجرانوالہ کی شعری روایت اور شہزاد نیّر کی شاعری is my own work and has not been submitted previously by me for taking any degree from this University (Minhaj University, Township, Lahore) or anywhere else in the country/world.

At any time if my statement is found to be incorrect even after my Graduate the University has the right to withdraw my M.Phil degree.

Student/Author Signature_____

Name:_____

فہرست

پیش لفظ

باب اوّل

گوجرانوالہ کی شعری روایت۔۔۔پس منظر و پیش منظر

ادب اور شاعری کی تعریف

گوجرانوالہ کی تاریخ

گوجرانوالہ کی شعری روایت کا پس منظر

گوجرانوالہ کی شعری روایت کا پیش منظر اور عصری شعری منظر نامہ

باب دوم

میجر (ر) شہزاد نیّر۔۔احوال و آثار

سوانح

شخصیت

تصانیف

شہزاد کی ترجمہ نگاری اور تنقید نگاری

باب سوم

شہزاد کی نظم نگاری

اردو نظم۔۔۔ تاریخ وارتقاء

شہزاد کی نظم کا فکری وفنی جائزہ

(نعت، منقبت، طویل نظمیں، آزاد نظم)

باب چہارم

شہزاد کی غزل اور شعری مقام ومرتبہ

اردو شاعری میں غزل کی روایت

شہزاد نیّر کی غزل کا فکری وفنی جائزہ

شہزاد نیّر کا شعری مقام ومرتبہ

پیش لفظ

ہر قسم کی حمد و ثنا اس پاک اور بابرکت ذات کے لیے جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔ اللہ رب العزت کا کروڑ ہا شکر مجھ پر لازم و ملزوم ہے کہ جس نے میرے لیے علم کے راستے ہموار کیے اور مجھے قوتِ تحریر بخشی۔ یہ رب تعالیٰ کی مہربانی اور کرم ہے اگر اللہ کی رحمت میری بہترین زادِ راہ نہ ہوتی تو میں یہ کام ہر گز نہ کر پاتی۔ اس نے مجھے لکھنے اور تحقیق جیسے مشکل امر کو سر انجام دینے کا حوصلہ بخشا۔ میں اپنے ادارے منہاج یونیورسٹی کی شکر گزار ہوں کہ اس عظیم دانش کدے کی طالبہ ہونے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا اور یہاں میں عظیم معلّمین سے مستفید ہو سکی۔ میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر فضیلت بانو کی شکر گزار ہوں۔ میں نگرانِ مقالہ ڈاکٹر مظفر عباس صاحب کی بے حد ممنون ہوں کہ جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور جن کی معاونت اور حوصلہ افزائی سے میرا مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ میں ان تمام اساتذہ کی شکر گزار ہوں جن سے اس ایم فل کے دوران میں نے پڑھا اور سیکھا۔ میں محترم شہزاد نیّر کی شکر گزار ہوں جن کی باوقار اور بے لوث شخصیت نے میری ہر ممکن مدد کی اور ہمیشہ تعاون فراہم کیا۔ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے دوران بھی ہمیشہ ہنس کر اپنا قیمتی وقت دیا اور حوصلہ افزائی کی۔ ان کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ میں اپنے والد شیخ محمد یحییٰ طاہر اور والدہ ممتاز کوثر کی نہایت مشکور و ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے بے انتہا اعتماد و پیار دیا ان کے مجھ پر کیے یقین اور اعتماد نے آج میرا میری ذات پر ایقان گہرا کر دیا ہے۔ آج میں جو بھی ہوں ان کی بدولت ہوں ۔ میری شخصیت میں جو خوبیاں ہیں وہ میرے والدین کی بدولت ہیں اور جو خامیاں ہیں وہ میری اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہیں۔ میں اپنے شریکِ حیات حافظ عبد الرقیب اور آنٹی ام کلثوم کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے حوصلہ بخشا۔ میں اپنے ہم مکتب ساتھی آنسہ منور اور سید بلال حسین کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے سیکھنے کے اس عمل میں میرا ہر قدم پر ساتھ دیا۔ اللہ پاک ان سب ہستیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین)۔

میرا یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں گوجرانوالہ کی شعری روایت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے باب میں شہزاد نیّر کی سوانح، تصانیف، تنقید اور ترجمہ نگاری وغیرہ کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ باب نمبر تین میں نظم نگاری کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے شہزاد کی نظم نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور چوتھے باب میں شہزاد کی غزل کا فکری، فنی اور موضوعاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ناقدین کی آراء کی روشنی میں ان کے شعری مقام و مرتبہ کا بھی

جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مقالے کے لکھنے کا مقصد گوجرانوالہ کی شعری روایت کا جائزہ لیتے ہوئے شہزاد کا شاعری کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس مقالے کو میں نے بہت محنت اور لگن سے تیار کیا ہے اور یہ ایک نو آموز طالبہ کی تحقیقی کاوش ہے۔ امید کرتی ہوں کہ ممتحن اور قارئین میری اس کاوش کو قبول کرتے ہوئے میری لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر کریں گے۔

حفصہ طاہرہ

باب اوّل

گوجرانوالہ کی شعری روایت۔۔۔پس منظر و پیش منظر

ادب اور شاعری کی تعریف

گوجرانوالہ کی تاریخ

گوجرانوالہ کی شعری روایت کا پس منظر

گوجرانوالہ کی شعری روایت کا پیش منظر اور عصری شعری منظر نامہ

باب اوّل

گوجرانوالہ کی شعری روایت۔۔۔پس منظر و پیش منظر

شہر گوجرانوالہ کا تعارف اوراس کی شعری ادبی روایت کے بیان سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ادب کیا ہے؟ادب کی کیا اہمیت ہے؟اورادب کی شعری روایت کیا ہے؟

ادب کیا ہے؟

ادب کے بارے میں جو پہلی بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ادب زندگی ہے اور یہ زندگی کا آئینہ دار بھی ہے۔کوئی بھی تخلیق کار یاادیب اپنے اردگرد پھیلی ہوئی چیزوں اورواقعات کامشاہدہ ایک الگ نظر اورزاویے سے کرتا ہے۔وہ زندگی کے حسن وقبح پر ایک الگ فکری رویے کے ساتھ غوروفکر کرتا ہے اوران ہی حقیقی تصویروں کو تخلیق پارے کے قالب میں ڈھال کر ایک نئے زاویے سے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ادب کے لغوی معنی کسی چیز کو حدِ نگاہ میں رکھنا کے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ (۱) میں ادب کے معنی ہیں:

> "ع،اسم مذکر(۱)کسی چیز کو نگاہ میں رکھنا،نگہداشت(۲)طریقہ،پسندیدہ،ڈھنگ، اخلاق تہذیب(۳)طور،طریقہ،ضابطہ،اصول،دستورُالعمل(۴)علم زبان،علم عربی (۵)حیا،شرم،لحاظ،لاج(۶)تعظیم،تکریم(۷)(بحالتِ ندا)صرف اردو میں کُتے کے دھتکارنے کو بھی ادب کہتے ہیں دھوت، دور ہو۔ چلاجا۔ پرے ہٹ (۸)عجزونیاز، فروتنی وانکسار۔"

اگر اصطلاح میں ادب کی تعریف بیان کی جائے تو ابن خلدون (۲) کے مطابق:

> "علم ادب،دراصل مختلف علوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ان سب علوم کا مقصد کلام میں حسن وتاثیر پیدا کرنا ہوتا ہے۔"

یعنی زبان کو نکھارنے اور سنوارنے کا نام ادب ہے۔ تخلیق کار اپنے مشاہدے کو ایک خوبصورت قالب میں ڈھال کر سماج کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ چونکہ ادب پارے میں موجود سماجی تصویریں لوگوں کی آرزوؤں، تمناؤں اور خوابوں سے سجی ہوتی ہیں اور اس طرح معاشرے کا ہر فرد ادب سے کسی نہ کسی طرح جُڑ جاتا ہے۔ کسی بھی سماج اور اس کے افراد کا مطالعہ ادب ہی کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔ ادب معاشرے کی آنکھ، کان، ناک اور ذہن ہوتا ہے۔ ایک ادیب زندگی میں پھیلے ہوئے بہت سے حالات و واقعات، حادثات اور روزمرہ کے معمولات کو دیکھتا اور جانچتا ہے اور ان مناظر کو وہ زبان عطا کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ادب خوبصورت انداز اور پیرائے میں اظہارِ مدعا کا نام ہے یعنی اپنے خیالات کو قرینے اور سلیقے سے بیان کرنا ادب ہے۔ یہ بیان نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی صورت میں اس کے الفاظ نپے تلے ہوں اور مفہوم واضح ہو رہا ہو تو اسے ادب کہا جائے گا۔

فتح پوری (۳) لکھتے ہیں:

> "ادب حقیقتاً ایک ریکارڈ ہے ان تمام تجربات واحساسات کا جن سے ایک انسان اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے گویا بہ الفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب زندگی کا اظہار ہے، الفاظ کے ذریعے سے اور اس لیے جس طرح ادب کی تخلیق زندگی سے ہوتی ہے، اسی طرح زندگی کی تخلیق بہت کچھ ادب پر منحصر ہے۔"

لفظ ادب عربی زبان سے اردو میں آیا ہے جس کے معانی پرانی عربی میں دعوتِ طعام کے تھے لیکن بعد میں ادب کی اصطلاح کو زبان و بیان کے تحریری اظہار کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی پہلی صدی میں ادب میں تعلیم کا معانی و مفہوم شامل ہو گیا تھا، اسی طرح فارسی میں بھی ادب کے جو معانی بتائے گے ان میں ذہنی و باطنی تربیت کا مفہوم موجود تھا، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام علوم جن سے ذہنی تربیت ہوتی ہے اور ذوق اور تخیل پروان چڑھتا ہے ادب کہلاتے ہیں۔

عبداللہ (۴) ادب کی تشریحی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ادب وہ فنِ لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات وافکار کو اپنے خاص نفسیاتی وشخصیاتی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی

کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی وتنقید بھی کرتا ہے اور
اپنے تخیل اور قوت مخترعہ سے کام لے کر اظہاروبیان کے ایسے مسرت بخش حسین اور
موثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن سے سامع و قاری کا جذبہ و تخیل بھی تقریباً اسی طرح
متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوا۔"

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی بیان کردہ یہ تعریف ادب کی ایک جامع تعریف ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ادب فنِ لطیف کا نام ہے اور اس فنِ لطیف کا ایک مخصوص موضوع زندگی کا بیان ہے، الفاظ اس فنِ لطیف میں مرکزی مقام ومرتبہ رکھتے ہیں یعنی ادب کے لئے بامعنی الفاظ کا ہونا ضروری ہے اور یہی الفاظ ادب کو غیر ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے الگ کرتے ہیں۔ الفاظ کے علاوہ ادب میں تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ادب بلند تخیل اور اعلیٰ فکری سوچ سے تخلیق پاتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے مطابق ادب مخصوص قسم کے تحریری سرمائے کا نام ہے لیکن ہر تحریری سرمایہ ادب نہیں ہے، ادب میں داخلیت ہوتی ہے جبکہ غیر ادب میں خارجیت ہوتی ہے اس کے علاوہ ادب میں زندگی کی ترجمانی حسین انداز میں کی گئی ہوتی ہے اور ادب ایک مخصوص ہیئت کا بھی پابند ہوتا ہے۔

ادب کی اقسام:

ادب کی کئی شاخیں ہیں۔ ان میں جو بنیادی فرق ہے وہ اظہار کے طریقوں کا ہے۔ نظم یعنی شاعری اور نثر ادب کی دو اہم اور بنیادی شاخیں ہیں۔ ان میں سے ہم یہاں صرف شاعری کو زیرِ بحث لائیں گے۔

شاعری:

شاعری جذبات کا خوبصورت اور واضح اظہار ہے۔ شاعری کا تعلق جذبات، احساسات اور شعور وادراک سے ہے جو دِلوں پر جادو کر سکنے کا فن جانتی ہے۔

شاعری کی تعریف بیان کرتے ہوئے بریلوی (۵) لکھتے ہیں:

"شاعری جذبات کی دل آویز موسیقی ہے۔ احساسات کی حسین مصوری ہے، تخیل کا
ایک دل فریب رقص ہے۔ وہ جنت نگاہ بھی ہے اور فردوس گوش۔ زندگی میں اس سے

اجالا ہوتا ہے۔افراد اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔وہ جینا سکھاتی ہے۔زندگی کا
احساس بڑھاتی ہے۔اس کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتی ہے۔"

شاعری کے بنیادی عناصر موضوع اسلوب اور ہیئت ہیں۔ایک شاعر کو مواد اردگرد کے ماحول سے ملتا ہے اوراس میں اس کے اپنے جذبات و احساسات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔اپنے ان جذبات کو وہ ایک مخصوص ہیئت اور اسلوب کے دائرہ میں رہتے ہوئے بیان کرتا ہے۔شاعری میں ایک اور بنیادی چیز وزن ہے۔وزن اور آہنگ کا ملاپ ہی اچھی شاعری کو جنم دیتا ہے۔

حالی(٦)"مقدمہ شعر وشاعری میں ارسطو کے قول کی طرف اشارہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے عالم
محسوسات،دولت کے انقلابات،سیرتِ انسانی معاشرتِ نوع انسانی،تمام چیزیں جو فی
الحقیقتاً موجود ہیں،اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیاء کے اجزاء کو ایک دوسرے
کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں،
شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے،جس قدر خیال کی قلمرو"

یعنی شاعری انسانی جذبات کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے شاعر کے اندر چھپی ہوئی صلاحتیں اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔انسان کے عقل وشعور نے جیسے جیسے ترقی کی منازل طے کی شاعری کو عروج ملتا گیا اور شاعری میں نئی نئی اصناف داخل ہوتی گئی۔ حمد،نعت،مرثیہ،قصیدہ،مثنوی،غزل،رباعی،نظم،ہائیکو،ماہیا،داستان وغیرہ سب شاعری کی اصناف ہیں۔

گوجرانوالہ کا تعارف:

گوجرانوالہ شہر شمالی پنجاب پاکستان میں واقع ہے اور یہ صنعتی شہر ہے۔یہ شہر لاہور سے تقریباً ٦٠ کلومیٹر دور ہے،آبادی کے لحاظ سے یہ ملک کا پانچواں بڑا شہر ہے۔گوجرانوالہ ڈویژن میں چھ اضلاع اور سترہ تحصیلیں ہیں، اگر ضلع گوجرانوالہ کی بات کی جائے تو اس میں چار تحصیلیں ہیں۔

١۔ تحصیل گوجرانوالہ

۲۔ تحصیل کاموںکے

۳۔ تحصیل نوشہرہ ورکاں

۴۔ تحصیل وزیر آباد

اس ضلع کے شمال مغرب میں حدِ دریائے چناب ہے جو اس کو گجرات اور شاہ پور کے اضلاع سے جدا کرتی ہے، اس شہر کے شمال مشرق کی طرف ضلع سیالکوٹ جنوب کی طرف ضلع لاہور، جنوب مغرب کی طرف منٹگمری اور جھنگ کے اضلاع ہیں۔ اس ضلع کا رقبہ ۳۰۰۰ مربع میٹر ہے۔

شہر گوجرانوالہ کی قدامت کے حوالے سے قاضی (۷) لکھتے ہیں:

> "آج کے گوجرانوالہ یا اس کے ارد گرد کا علاقہ چینی سیاح ہیون سانگ کی تحریروں کے مطابق ۶۳۰ ق م میں بھی آباد تھا۔ اس نے ایک شہر tsc-kia یا taki یعنی سیکیا یا ٹاکی کی نشاندہی کی ہے۔ جنرل کننگھم یہیں آس پاس ہی یعنی ٹھٹھہ سیدا ں کے قریب ایک سٹو پایا ایک چھوٹے سے ٹیے سالار salar کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کے خیال میں بدھ کے خاصے بڑے مجسمے یابت کی باقیات ہیں۔"

گوجرانوالہ کا پرانا نام خان پور ساہنسی تھا۔ کچھ روایات کے مطابق ۱۷۶۵ء میں چڑت سنگھ نے خان پور ساہنسی کو ایک شہر کی شکل دی۔ اور اس کو اوّل آباد خان جاٹ ساہنسی نے کیا تھا اور اسی نے اس کا نام خان پور ساہنسی رکھا تھا۔

غلام سرور لاہوری (۸) "تاریخ مخزن پنجاب" میں لکھتے ہیں۔

> "پہلے آبادی اس کی بمرور عرصہ تین سو برس کے مسمی خاں جاٹ گوت ساہنسی نے قائم کی اور نام اس کا خان پور ساہنسی رکھا بعد مرور کسی قدر عرصہ کے قوم جاٹ (گوجر) اس گاؤں میں قابض ہو گئی اور باقی کی اولاد بالکل بے دخل ہو گئی گوجروں نے اس کا نام بدل کر گوجرانوالہ رکھا"

"تاریخ مخزن پنجاب" اور "یہ گوجرانوالہ ہے" میں شہر گوجرانوالہ کو تاریخی شہر قراد دیا گیا ہے مگر اسد سلیم اپنی کتاب "نگر نگر پنجاب" میں جدید گوجرانوالہ کو ایک نیا اور غیر تاریخی شہر قرار دیتے ہیں۔

شیخ(۹)لکھتے ہیں:

"جدید گوجرانوالہ تاریخی شہر نہیں ہے۔کچھ عرصہ پہلے اس کا وجود تک نہ تھا۔مغلیہ دور کی کتابوں میں اس کا نام تک نہیں ملتا۔اکبر کے عہد میں یہاں ایمن آباد اور موہدرہ بنائے گئے۔خود گوجرانوالہ شہر گمنام رہا۔اٹھارہویں صدی میں یہ علاقہ قریب قریب ویران تھا اور یہاں عظیم چراگاہ تھی جو شرقاً غرباً گیارہ کلو میٹر چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھی۔اس کے مشرقی حصہ کو جھنگی اور مغربی حصہ کو ڈھکی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔"

مگر "تاریخ مخزن پنجاب" میں اسے تین سو سال پرانا اور "تاریخ گوجرانوالہ" میں اس کو پانچ سو برس پرانا شہر قرار دیا گیا ہے اور اس کا ابتدائی نام خان پور ساہنسی تھا لیکن گوجروں اور ساہنسوں کے درمیان اقتدار کی جنگ جو تقریباً پانچ برس تک جاری رہی اس جنگ کے نتیجے میں ساہنسوں کی قوت کمزور پڑنا شروع ہو گئی اور بالآخر گوجروں نے شہر پر چاروں جانب سے گھیراؤ کر لیا اور ایک خونی جنگ کے نتیجہ میں خان پور ساہنسی گوجرانوالہ میں تبدیل ہو گیا۔

"جغرافیہ پنجاب" میں ایم اے علوی(۱۰)اس شہر کا ذکر کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"یہ جرنیلی سڑک اور فورتھ ویسٹرن ریلوے کی شاہراہِ اول پر واقع ہے یہ نہایت سرسبز اور شاداب مقام ہے۔یہاں سنترے،مالٹے کے باغات ہیں ان میں عمدہ قسم کے مالٹے پیدا ہوتے ہیں جو پنجاب بھر میں مشہور ہیں زرعی پیداوار کے علاوہ یہاں صنعت و حرفت کا بھی چرچا ہے چنانچہ لوہے کی الماریوں اور ٹرنک پیتل اور تانبے کے برتن اور لکڑی کا آرائشی وزیبائشی سامان بکثرت بنتا ہے اس کی آبادی سوا لاکھ کے قریب ہے۔"

زرعی پیداوار کے لحاظ سے یہ زرخیز شہر ہے، یہاں پر گندم، کالے چنے، سفید چنے، جو، توریاں، دھان، مسور وغیرہ کی پیداوار کافی زیادہ ہے۔یہاں سے پیتل، کانسی کے بڑے خوبصورت برتن اور لوہے کے صندوق وغیرہ تیار ہو کر دوسرے شہروں کو بھیجے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ کپڑے کی بہت سی فیکٹریاں ہیں۔گوجرانوالہ شہر پہلوانی کی وجہ سے بھی خصوصی شہرت رکھتا ہے۔

گوجرانوالہ کی شعری وادبی روایت:

یہ تو ہو گی اس شہر کی کچھ جغرافیائی معلومات مگر ہمارا مقصد اس شہر بے مثال کی ادبی و شعری روایت کا احاطہ کرنا ہے۔ادبی حوالے سے بھی اس شہر کی اہمیت کسی طور پر بھی اس کی تاریخی اہمیت سے کم نہیں۔بلکہ اس شہر "گوجرانوالہ" کی ادبی روایت اس کو ایک شہر بے مثال بنا دیتی ہے۔اس سرزمین سے بے شمار ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، صحافیوں اور علمائے کرام نے جنم لیا ہے۔اس شہر بے مثال نے ایسے ہزاروں ادباء ومشاہیر کو پروان چڑھایا جنہوں نے اپنے علم و فن کی بدولت دنیا میں اپنا نام روشن کیا اور کلاسک کے درجے تک جا پہنچے۔

قاضی(۷)لکھتے ہیں

> "تاریخ کے اوراق پلٹنے اور ماضی کو کھنگالنے پر جہاں اور چیزوں کے بارے میں ہمیں جانکاری ہوتی ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علم و ادب کے میدان میں بھی گوجرانوالہ کسی سے پیچھے نہیں رہا بلکہ اس لحاظ سے تو یہ خاصا مردم خیز خطہ رہا ہے۔اگر ضلع گوجرانوالہ کی ادبی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو لکھاریوں کی تعداد یقیناً سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے۔"

تقسیم سے پہلے کے غیر مسلم شعراء میں پنڈت کالی داس، گوری ناتھ گوہری، منتھرا سنگھ شفیق، ہریجن سنگھ ٹھکن اور امرتا پریتم کا نام قابل ذکر ہے۔ان غیر مسلم شعراء نے گوجرانوالہ اور اس کے ادب کے حوالے سے پنجابی اور اردو زبان کی بہت خدمت کی۔ تقسیم سے پہلے کی گوجرانوالہ کی ادبی فضا نہایت خوشگوار تھی۔ادبی محفلوں اور مشاعروں کا دور تھا جن میں ہندوستان بھر کے مشہور و معروف شعراء وادیب شرکت کرتے تھے۔ تقسیم سے پہلے کی اس فضا و ماحول کو بعد میں آنے والوں نے بھی قائم دائم رکھا اور اس ادبی سلسلے کو نہایت تسلسل اور کامیابی سے آگے بڑھایا۔

شیخ(۹)لکھتے ہیں:

> "گوجرانوالہ زیادہ قدیم شہر تو نہیں اور اس کی وجہ شہرت زیادہ تر صنعت کی وجہ سے رہی ہے مگر علم و ادب کے میدان میں کئی بڑے نام اس شہر سے منسوب ہیں جیسے بابائے

پنجابی ڈاکٹر فقیر،پنڈٹ کالی داس،لالہ پنڈی داس،بلونت سنگھ،امرتا پریتم،مولوی انشاءاللہ خاں،ارشد میر،الطاف گوہر،رضیہ بٹ،محمد ہادی حسین،ممتاز صدیقی،مولانا نصر اللہ خاں عزیز،ڈاکٹر وحید قریشی،جسٹس دین محمد شیخ،مظفر علی سید،عزیز لدھیانوی،محمد دین فانی،امین خیال،تنویر بخاری،حافظ محمد جھنڈا،عبد الغنی وفا وغیرہ شامل ہیں۔"

کسی بھی شہر کے ادب کو پروان چڑھانے میں ادبی محفلیں اور ڈیرے نہایت اہم کردارادا کرتے ہیں۔ گوجرانوالہ کے ادبی ڈیروں میں چند کا ذکر ذیل میں ہے۔

ادبی سنگت:

ادبی سنگت کا آغاز شہر گوجرانوالہ میں ۱۹۷۵ءمیں ہوا۔اس کے پہلے صدر خواجہ اسحاق تھےاور پہلے سیکریٹری کانام شبر زیدی تھا۔اس کے زیر اہتمام بہت سی اہم کتابوں کی تعارفی تقاریب کا انعقاد کیا گیا۔اس کے علاوہ ادبی سنگت کی طرف سے "سنگت" کے نام سے ادب کاایک نمائندہ انتخاب بھی شائع کیا گیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق:

حلقۂ اربابِ ذوق گوجرانوالہ کا قیام عمل میں آیاتو محمود احمد قاضی کو سیکریٹری اور ساغر شیدائی کو جوائنٹ سیکریٹری چناگیا۔اس حلقے کے قیام نے گوجرانوالہ کے سیاسی ماحول میں مزاحمت کی فضا قائم کر دی۔

مرکزی سفینۂ ادب:

مرکزی سفینۂ ادب گوجرانوالہ کے نام سے تنظیم ہے جس کے سیکریٹری سعد اقبال سعدی ہیں۔اس تنظیم کے تحت مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔اس کے علاوہ ادبی ڈیروں میں "بزم اقبال"،"نئی لہر"،"تخلیقِ ادب"، "انجمن ناموس قلم"،"مرکزی بزمِ وفا"،"انجمنِ فروغِ ادب"اور"انجمن ترقی پسند مصنفین" قابل ذکر ہیں۔

رسائل وجرائد:

شہر گوجرانوالہ کے ادبی مجلّوں میں "مجلہ قرطاس"، "مجلہ لوح و قلم"، "مجلّہ علم صنعت" قابل ذکر ہیں۔ "مجلّہ قرطاس" ڈاکٹر اسحاق جاوید اور جان کاشمیری کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ "مجلّہ لوح و قلم" کچھ عرصہ تک عطا محمد اسلامیہ ہائی سکول کے طلباءاور اساتذہ کی زیر نگرانی شائع ہوتا رہا۔ جبکہ "مجلّہ علم صنعت" ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک شائع ہوتا رہا جبکہ موجودہ دور کے ادبی جرائد میں "فروغ"، "قرطاس" اور "ادراک" نمایاں ہیں۔ مجلّہ "فروغ" اقبال نجمی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ "قرطاس" اب سہ ماہی رسالے کی حیثیت سے جان کاشمیری کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

غرض کہ گوجرانوالہ شہر کی ادبی شعری روایت کا منظر نامہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ادب کے فروغ میں اس شہر کے ادباء شعرا کا ایک خاص مقام ہے جس کو ضبطِ تحریر میں لانا یقیناً ایک دلچسپ امر ہو گا۔

گوجرانوالہ کا شعری منظر نامہ:

ہم گوجرانوالہ کے شعری منظر نامے کو دو حصوں میں بیان کر رہے ہیں، پس منظر اور پیش منظر۔

پس منظر:

مولانا ظفر علی خان:

مولانا ظفر علی خان وزیر آباد کے نزدیک ایک گاؤں کرم آباد میں جنوری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام "سراج الدین" تھا جو کہ پیشے کے اعتبار سے ایک صحافی تھے اور اخبار "زمیندار" نکالا کرتے تھے۔ یہ اخبار زمینداروں کی رہنمائی کے لئے نکالا جاتا تھا۔ ظفر نے ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان ریاست پٹیالہ سے اور ایف اے اور بی اے کے امتحانات علی گڑھ سے پاس کیے۔ ظفر کی شادی بہت ہی کم عمری میں بارہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی۔ دوران تعلیم علی گڑھ تحریک اور اور سر سیّد سے وابستگی پیدا ہوئی۔ ظفر کے نزدیک علی گڑھ ایک جان پرور چمن تھا، ایک ایسا مرکز جو بہترین عادات و خصائل کے پیدا کرنے میں معاون اور خصوصی مددگار

تھا۔ علی گڑھ نے ظفر کی شخصیت کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیااور ان کی طبیعت میں ملت اسلامیہ کی خدمت کے جذبے کے ساتھ ساتھ زمانے کے نئے تقاضوں کی سمجھ بوجھ بھی پیدا ہو گئی اور ان کے ہاں غور و فکر کا ایک نیا اسلوب بھی پروان چڑھا۔ بطور ملازم ریاست حیدر آباد دکن میں چند سال قیام کیااور حیدر آباد دکن سے رسالہ "دکن ریویو" کا اجراء کیا۔ تقریباً تیرہ سال حیدر آباد دکن میں قیام کیا۔ والد کی وفات سے کچھ عرصہ قبل حیدر آباد سے واپس آ گئے۔ مرتے وقت والد نے ہی یہ درخواست کی کے اس اخبار کو بند نہیں ہونا چاہیے جسے میں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد مولانا نے "زمیندار" کی ادارتی ذمہ داریوں کو پوری طرح سنبھال لیااور دل جمعی کے ساتھ اپنے اس اخبار کو جاری رکھنے کے عزم پر قائم رہے اوراس اخبار کی علمی و ادبی حیثیت کو بلند مقام تک پہنچادیا۔

زیدی(۱۱) لکھتے ہیں:

> "مولانا ظفر علی خان کے سیاسی شعور کی تشکیل میں چھ شخصیتوں نے بھرپور حصہ لیا تھااور ساتویں چیز بین الاقوامی سیاسی حالات تھے ان عوامل نے ان میں ذہنی پختگی پیدا کی اور خارزار سیاست میں چلنا سکھایااسی سبب سے وہ ایک مضبوط عزم کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کے لیے بڑھتے چلے گئے، اور اس کے لیے انہوں نے قلم سے نیزہ کا کام لیا، اور اپنی ولولہ انگیز فکر کو نظم و نثر کے قالب میں ڈھالتے رہے، اور عمل کے میدان میں بھی وہ گھن گرج کے ساتھ دشمن کے سامنے صف آرا ہو کر اپنی بلند حوصلگی کا خراجِ تحسین دوستوں سے ہی نہیں بلکہ دشمنوں سے بھی حاصل کرتے رہے۔"

انہوں نے ہندوستان کی عملی سیاست میں بھر پور حصہ لیا۔ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاعری، نعت گوئی اور طنز و مزاح میں بھی اپنانام بنایااور ایک الگ مقام حاصل کیا۔ سیاسی تحریکوں میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیااور بہت دفعہ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلی۔ تحریک خلافت میں حصہ لینے کے بعد پانچ سال جیل میں گزارے۔ ادب کے حوالے سے ظفر کی تصانیف و خدمات کی ایک طویل فہرست ہے انہوں نے نظم و نثر دونوں اصناف کے حوالے سے بہت کچھ لکھا۔ نثر میں انہوں نے افسانے، مضامین، ڈرامے، سوانحی کتب، تبصرے وغیرہ لکھے اس کے علاوہ بہت سی انگریزی کتب کے اردو تراجم بھی کیے۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری ہندوستان کے پُر آشوب حالات وواقعات کی آئینہ دار ہے۔پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی شعوراور جذبہ ایمان پیدا کرنے کے لیے انہوں نے اپنی صحافت اور سیاست کے ساتھ ساتھ شاعری کا بھی سہارالیا۔ ظفر کی شاعری ایک سیاسی اور صحافتی مزاج کی حامل ہے۔ ظفر ایک زود گو اور فی البدیع شاعر کے طور پر شہرت رکھتے ہیں جنہیں حسبِ فرمائش اور حسبِ صورتحال شعر کہنے پر مکمل قدرت حاصل تھی۔

ان کے چار شعری مجموعے جو کہ ان کی زندگی میں چھپے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱-بہارستان (۱۹۳۲ء)

۲-نگارستان (۱۹۳۷ء)

۳-چمنستان (۱۹۴۴ء)

۴-حبسیات (۱۹۲۶ء)

ان کی شاعری کے حوالے سے زکریا(۱۲)لکھتے ہیں:

> "ظفر علی خاں کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ہنگامی ہے۔وہ ہندوستان کے ایک پُر آشوب دور کی تصویر ہے جو یک رخی بھی ہو سکتی ہے لیکن چونکہ مسلمانانِ ہند کے جذبات عکاس ہے اس لیے اپنے زمانے میں اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔اب ان نظموں کے بہت سے واقعات تفہیم کے لیے حواشی کے محتاج ہیں نظموں کے بہت سے کردار بالکل فراموش ہو چکے ہیں تاہم ان کی شاعری میں کچھ پائیدار عناصر موجود ہیں جو آج کے قاری کو بھی متاثر کر سکتے ہیں لیکن ان کے ضخیم کلام میں دب گئے ہیں۔"

ظفر کی شاعری ان کے سیاسی شعور اور مزاج کی طرف اشارہ کرتی ہے۔انہوں نے اپنی صحافت،سیاست اور شاعری کی مدد سے عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی اور سیاست کو خواص کے حلقے سے نکال کر عوام تک پہنچا اور پھیلا دیا۔انہوں نے ہندوستان کی سیاست میں حصہ بھی لیا اور اس وقت کے سیاسی حالات اور نامور

شخصیات پر طنز کے گہرے وار بھی کیے۔ ظفر کی شعری میں تیزی اور تندی کا عنصر زیادہ ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بدیہہ گوئی کی صلاحیت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ مثال درج ذیل ہے:

راہ چلتے چلتے، گڑھ شنکر، کی ٹم ٹم رک گئی
جو چلاتا تھا اسے، لنگڑا وہ ابلق ہو گیا
شاعری میں بذلہ سنجی ہے مرا اندازِ خاص
زندہ میرے نام سے نامِ فرزوق ہو گیا

(لنگڑا ابلق)

ظفر کی شاعری کے حوالے سے آغا(۱۳) رقمطراز ہیں:-

"ظفر علی خاں کی شاعری میں جوشِ ایمانی زیادہ ہے، اس لیے ان کی طنز کا وار تیکھا اور بلاواسطہ ہے، اور یہ ناموسوم بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری سے ظرافت کا وہ عنصر جو وقت کی دیوار عبور کر جاتا ہے مفقود ہو گیا۔"

ظفر کی شاعری میں ظرافت کا عنصر اگرچہ کم سہی مگر طنز کی نہایت گہری اور تیز دھار موجود ہے جس کے ذریعے وہ اپنے مخالفین اور حریفوں پر گہری چوٹ لگاتے تھے اور اکابرِ سیاست پر وار کرتے تھے۔ ان کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:-

؎قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہی حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

؎خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

کھلا جب قتل کی تفشیش کا دفتر ولایت میں
بغل میں لائے بستہ داب کر گاندھی ضمائر کا

مولانا ظفر علی خاں بطور نعت گو بھی اپنا ایک الگ اور انفرادی مقام رکھتے ہیں اور ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری ان کی اسلام سے محبت کی گواہ ہے۔ حمدیہ شاعری میں نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ خدا تعالیٰ کی صفات بیان کی ہیں اور ان کے لطف و کرم کا ذکر کیا ہے۔

ہے سورج اس کی عنایت سے ذرہ ناچیز
ہے پربت اس کی توجہ سے دانہ خردل
خدا کی ذات ہے قطرہ کون و مکاں
اگر ہے عین مفصل تو ہے اثر مجمل
چمک چمک کے شہادت خدا کی دیتے ہیں
عطارد و قمروشمس ومشتری وزحل
ازل کی صبح سے بے وقفہ چل رہی ہے یونہی
خدا کے ایک اشارے پہ کائنات کی کُل

ظفر نے مغلوب و مظلوم مسلمانوں کے اندر جذبہ ایمان کی حرارت پیدا کرنے کے لیے نعت گوئی کا سہارا لیا۔ ان کی نعتیہ شاعری میں سادگی و سلاست کی خوبی موجود ہے اور ایک وارفتگی اور بے ساختگی کا احساس نمایاں ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری کی انفرادیت کی وجہ ان کا قومی و سیاسی شعور ہے۔ انہوں نے نعت گوئی کو اصلاح و تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ غرض کہ ظفر علی خاں ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے ادب کی بے دریغ خدمت کی۔

اردو سے محبت ان کی فطرت میں رچی ہوئی تھی۔ ظفر تاریخ کے لافانی کردار ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں ایک غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہیں۔

یوسف ظفر:

یوسف ظفر جن کا اصل نام شیخ محمد یوسف جبکہ قلمی نام یوسف ظفر تھا اور اسی نام سے انہوں نے شہرت پائی۔ یوسف ظفر یکم دسمبر ۱۹۱۴ کو شہر مری میں پیدا ہوئے لیکن ان کا آبائی علاقہ ضلع گوجرانوالہ کا ایک قصبہ رسول نگر تھا۔ والد محترم کا نام شیخ غلام رسول تھا جو کہ پہلے مری میں چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے۔ مری سے وہ روالپنڈی منتقل ہو گئے۔ ظفر نے ابتدائی تعلیم روالپنڈی سے ہی حاصل کی، بعد ازاں ان کا گھرانہ آبائی قصبے منتقل ہو گیا۔ انٹر تک کی تعلیم یوسف ظفر نے گوجرانوالہ سے حاصل کی اور سناتن دھرم کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کے بعد تلاشِ معاش کے سلسلے میں دہلی تک جا پہنچے۔ انہوں نے بہت نامساعد حالات میں زندگی بسر کی۔ ۱۹۳۸ء میں لاہور آ گئے، لاہور میں انہوں نے پانچ سال محکمہ انہار میں کلرکی کی۔ ان ہی دنوں انہوں نے حلقۂ اربابِ ذوق میں شمولیت اختیار کی اور حلقے کے سرگرم رکن بن گئے۔ ۱۹۴۳ء میں ادبی ماہنامہ "ہمایوں" کے نائب مدیر کے طور پر تقرر ہوا، اور تقریباً پانچ سال تک اس عہدے پر قائم رہے۔ ریڈیو آزاد کشمیر او ہفت روزہ "آزاد کشمیر" سے بھی وابستگی رہی۔ یوسف ظفر اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو روالپنڈی شہر میں دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا۔

وہ واقعہ جو یوسف ظفر کو بطور شاعر بیدار کرنے کا ذریعہ بنا نہایت لرزہ خیز ہے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۲۹ء کا دن جب والد گرامی کی وفات ہوئی۔ ان کی بہن والد کی موت کا یہ منظر نہ دیکھ سکیں اور حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال کر گئی۔ زندان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلی نظم اسی لرزہ خیز حادثے کی پیداوار تھی۔ یوسف کے شعری مجموعات کی تعداد چھ ہے۔ "زنداں" اور "زہر خند" ایک ہی دور میں چھپے۔ ان میں "زہر خند" بعد میں شائع ہوا اور "زنداں" پہلے مگر اس میں "زنداں" سے پہلے کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان دونوں مجموعات میں شامل نظمیں جنگ عظیم کے زمانے میں لکھی گئیں۔ "صدا بصحرا" تیسرا مجموعہ ہے جو کہ ۱۹۶۱ء میں سولہ سال کے طویل عرصے کے بعد سامنے آیا۔ چوتھا مجموعہ "حریمِ وطن" ہے جو ۱۹۶۱ء میں چھپا۔ پانچواں "نوائے ساز" جو ۱۹۶۲ء میں

چھپا۔ آخری مجموعہ "عشقِ پیچاں" تھا جو یوسف ظفر نے اپنی زندگی میں ترتیب دیا تھا مگر شائع ان کی وفات کے بعد ہوا۔ یوسف ظفر حلقۂ اربابِ ذوق کے بنیادی اراکین میں شمار ہوتے تھے۔ یوسف ظفر ایک مضمون نگار، غزل گو، نظم نگار، مترجم اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ایک فعال شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اپنے دور کے مسائل کا تلخی سے ذکر کیا گیا ہے۔ روشنی کی تلاش اور تحرک ان کی نظموں کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کی شاعری میں موت سے خوف اور نفرت کا احساس نمایاں ہے، ذاتی و داخلی کرب و تکلیف اور موت سے خوف کا یہ احساس یوسف ظفر کو روشنی کا متلاشی بنا دیتا ہے۔ آغا(۱۴) لکھتے ہیں:

> "یوسف ظفر کے ہاں روشنی کی خواہش بے حد نمایاں اور حرکت کی آرزو بے حد شدید ہے اور اس خواہش کا یقیناً اس کی ابتدائی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ روشنی کے لیے ایک تیز خواہش کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ تاریکی سے خوفزدہ ہے اور حرکت کے لیے شدید آرزو اس بات پر دال ہے کہ بے حسی، انجماد اور ٹھہراؤ میں اسے اپنی موت نظر آتی ہے۔"

یوسف ظفر کی شاعری میں داخلی غم اور کرب کے احساس کے ساتھ حالاتِ حاضرہ کے دکھوں کا مداوا اور مستقبل کی امید بھی شامل ہے۔ ان کی نظموں میں غم، خوف اور احساسِ مرگ کا شدید اور گہرا اثر بھی ملتا ہے۔ غم و خوف کی اس کیفیت کے پیچھے شخصی گھاؤ چھپے ہوئے ہیں۔ یوسف تخیل پرستی سے زیادہ حقیقت پر یقین رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کے اس حقیقت پسندانہ مزاج کی وجہ سے ان پر ترقی پسندی کا لیبل بھی لگا۔

اس پر بات کرتے ہیں ظفر(۱۵) خود رقمطراز ہیں:

> "جو میرے اسلوب سے مجھ پر ترقی پسندی کا لیبل لگاتے ہیں، سمجھ لیں کہ میں کسی مقصدی ادب کا قائل نہیں۔ میرے سامنے میری زندگی مرا ماحول، مرا وطن، میری دنیا، مری بے بسی ہے اور میں۔ ترقی پسندی میں کوئی برائی نہیں، ہر شخص ترقی پسند ہے لیکن ان کے ساتھ جن لوازمات کو وابستہ کر دیا گیا ہے اس سے جو مراد لی جاتی ہے میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔ میں ترقی پسند یا دوسرے الفاظ میں رجعت پسند نہیں۔

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ یوسف ظفر نے خود کو ترقی پسند فکر سے باہر کا آدمی ظاہر کیا ہے مگر اس بات کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ انہیں ترقی پسند فکر سے محض واجبی نوعیت کے اختلافات تھے۔ ہر سچا ادیب یا شاعر اپنے شعور کی قوت سے گرد و پیش کے حالات و واقعات کا جائزہ لیتا ہے اور ان کے متعلق اپنے رد عمل کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یوسف ظفر کی شاعری میں بھی یہ اظہار واضح نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں اسالیب اور موضوعات کا تنوّع بھی ملتا ہے۔

چند شعری مثالیں درج ذیل ہیں۔

اب مرا عزم ہے فولاد کی مضبوط چٹان
اب یہاں کانچ کی تلواریں نہیں رہ سکتیں
اب میں خود آگ ہوں ہر شے کو چلا سکتا ہوں
مجھ سے اب ہاتھ اُٹھاؤ، کہ میں جا سکتا ہوں

(زنداں)

کسے کہوں کہ ابھی ناتمام ہے انساں
نہیں تو عقل و خرد کا فریب کھا سکتا؟
یہ کم نظر جو خداؤں پہ مسکراتا ہے
خود اپنی کم نظری پر بھی مسکرا سکتا

(مستقبل)

زندگی کے بے کراں مرگھٹ میں دیکھ
میری راتوں کی کئی لاشوں کے ڈھیر
راکھ بن کر اڑ رہے ہیں ہر طرف

تیرگی میں کانپتے شعلے کئی

چونک اُٹھتے ہیں نگاہوں میں مری

میری راتیں جس طرح زخمی کی چیخ

مدتوں بے کارواں پھرتی رہے

اور آخر ایک دن کہسار سے

ایسے ٹکرائے کہ اس کی تلخ گونج

پتھروں سے آگ برسانے لگے

(حیات رائیگاں)

عمر کے آخری برسوں میں یوسف ظفر کا رجحان صوفیوں اور درویشوں کی طرف زیادہ ہو گیا تھا۔ اس دور کی شاعری میں اسلامی تہذیب اور خدا اور مذہب کے حوالے سے مضامین و موضوعات شامل ہیں۔ ان کے دو مجموعوں "حریمِ وطن" اور "عشق پیچاں" میں نعتیہ کلام بھی شامل ہے۔ ظفر کی نعتیہ شاعری عشقِ محمد ﷺ سے سرشار ہے۔

شکر کیسے ہو ادا اس لطفِ داور کے لیے
دی زباں جس نے مجھے عشقِ محمد کے لیے
میری آنکھوں کی ضیاء ہے گنبدِ خضریٰ کا نور
تاج ہے بطحا کی خاکِ رہ مرے سر کے لیے

مختار صدیقی:

مختار صدیقی کا اصل نام مختار الحق صدیقی تھا۔ مختار صدیقی یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والد سیالکوٹ سے گوجرانوالہ ہجرت کر گئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ سے حاصل کی جبکہ بی اے کا امتحان اسلامیہ کالج لاہور سے پاس کیا۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں انہوں نے بطور پروگرام اسسٹنٹ کام کیا۔ تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے اور ریڈیو پاکستان روالپنڈی سے منسلک ہو گئے۔ اس کے علاوہ پاکستان ٹیلی ویژن میں بطور سکرپٹ رائٹر بھی کام کیا۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء کو مختار اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ مختار صدیقی روایت پسندی اور جدت کے حسین امتزاج کے حامل شاعر تھے جن کی نظمیں ادبی تحریکوں اور سیاسی مقاصد کی ہنگامہ پرستیوں سے الگ اپنا منفرد مزاج رکھتی ہیں۔ شاعری ان کے نزدیک دل کے پُر اسرار گوشوں کو آسودہ حال کرنے کی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں۔

صدیقی (۱۶) لکھتے ہیں:

> "اگر کوئی فن پارہ ایک ماحول اور ایک خاص زمانے کے لیے ہو اس میں چند مخصوص دنوں کے مخصوص ماحول کی ترجمانی ہی نظر آئے یا اس میں کسی خاص زمانے اور خاص جماعت کے لیے کوئی فکری، سماجی یا سیاسی پیغام ہو تو اس کی حیثیت میرے نزدیک محض ایک تاریخی دستاویز کی ہے۔"

ان کے تین شعری مجموعے ہیں۔"

۱۔ منزلِ شب (۱۹۵۵ء)

۲۔ سی حرفی (۱۹۶۴ء)

۳۔ آثار (باقیات) ۱۹۵۵ء

منزلِ شب کی نظمیں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۵ء تک کے مخصوص حالات کی آئینہ دار ہیں اور ان کا مخصوص انداز ہے۔ان نظموں کی انفرادیت یہ ہے کہ قدیم تہذیب و ثقافت کے عروج و زوال کی تصویر پیش کرتی ہیں۔انہیں تاریخ اور آثار قدیمہ سے گہری دلچسپی اور لگاؤ تھا۔

ملک (۱۷) لکھتے ہیں:

> "مختار صدیقی کی ذات خود ان کے لیے ایک پوشیدہ خزانہ تھی۔اس خزانہ کی دریافت کے لیے انہوں نے بہت سے ہفت خواں طے کیے۔ذہنی اور مادی زندگی ذہنی زیادہ اور مادی کم کے ہر روپ کو دیکھا۔"

منزل شب کی نظموں پر میر اجی کا ایک خاص اثر نظر آتا ہے۔مختار کلاسیکی شعراء میں میر سے کافی متاثر تھے۔ماضی پرستی اور دروں بینی میر کی طرح ان کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔مختار صدیقی کا دوسرا شعری مجموعہ "سی حرفی" ہے۔یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔"سی حرفی" پنجابی اور مقامی شاعری کی ایک مقبول صنفِ سخن ہے جس میں چار چار مصرعوں پر مشتمل بند لکھے جاتے ہیں۔سی حرفی میں شاعر ابجد کے تیس حروف میں سے بالترتیب الف،ب،پ ہر حرف سے چار چار مصرعوں کے بند کا آغاز کرتے ہیں۔تمام بندوں میں ایک خاص صوفیانہ فضا ہوتی ہے۔

"سی حرفی" کی ایک مثال درج ذیل ہے۔

پیار کے گاہک ایسے دیکھے ہاتھ ان کے بک جانا پڑا
جنسِ وفا کمیاب سہی،پر ایسی تو نایاب نہیں
دل دریا ہیں بہر سے گہرے پر ڈوبے سو موتی لائے
قصر کے غوطہ زن ہی شناور یہ پانی نایاب نہیں

تیر ہوئے اڑتیس برس بھی عہد شباب سراب ہوا
ہار کی تلخی جیت کے سپنے لاگ اور میت کے پھیر گئے
دل نے تب بے حال رکھا تھا اب چاہاتو بحال کیا
کارِجہاں جب ہیچ ہوئے تو ان کے یہ دیر اندھیر گئے

اس مختصر مجموعے میں مختار کا فکری ارتقا واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اقبال کی فکر کا پہلو اپنا رنگ دکھاتا ہے تو دوسری طرف میر تقی میر کی صوفیانہ آوازیں اپنی طرف متوجہ کرتی نظر آتی ہیں۔ مختار کی شاعری کا تیسرا اور آخری مجموعہ "آثار (باقیات)" ہے جو ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کلام میں نظموں کے ساتھ غزلیات بھی شامل ہیں۔ حلقے سے وابستگی کی وجہ سے ان کی شاعری میں ادب کی جو جہت نمایاں نظر آتی ہے وہ انفرادی احساسات اور تجربات سے متعلق ہے، ان کی نظموں میں نسوانی نفسیات اور جذبات کا بیان بھی ملتا ہے۔ "آتش دان کا بت" ایک ایسی نظم ہے جس میں عورت کی نفسیات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ چاہے جانے کی چاہت اس کی فطرت میں شامل ہے۔

آج آہٹ پر نہ پتا کھڑکا

نور کے گولے کا جالے گا ابھی شب کا سفر

یہ خلش طعنے کی محرومی سنگیں میں ڈھلی

ان کہی یہ تھی، جو پتھر نے کہی میں نے سنی!

یونہی نیند اُکھڑی کیسے آنا تھا؟ آتا جو کوئی

بت تو خاموش ہے، اب لوٹیں بیت رات گئی

(آتش دان کا بت)

ان کی اکثر نظموں میں قنوطی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے موت کے تجربے کو پیش کیا ہے موت ان کے نزدیک زندگی سے فرار اور سکون کا نام ہے۔

فکر جنت ہے نہ تادیب کے شعلوں کا ہراس

شکر ہے کوئی دنیا ہے، جہاں آج نہ کل

(برزخ)

مختار کا زیادہ تر رجحان نظم معریٰ اور پابند نظم کی طرف رہا ہے۔ ان کی آزاد نظم میں فن کا وہ معیار نظر نہیں آتا جو نظم معریٰ یا پابند نظم میں دکھائی دیتا ہے۔ سعید (۱۸) لکھتے ہیں:

> "مختار صدیقی جدید اردو نظم کے ایک ایسے اہم شاعر ہیں جنہوں نے زیادہ تر پابند نظموں میں اپنے تازہ اور نئے جذبات کا استعاراتی اظہار کیا ہے۔ اپنے اولین شعری مجموعے "منزلِ شب" میں جہاں جہاں انہوں نے آزاد نظم سے اعانت حاصل کی ہے قاری کو ایک گونہ تشنگی کا احساس ہی رہا ہے۔ انہوں نے اپنی آزادہ روی پر کچھ قدغنیں عائد کر رکھی تھی۔۔ داخلی قدغنیں۔۔۔ کلاسیکی شعری روایت سے ان کی گہری وابستگی اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ نئے رجحانات اور ضابطوں کی مکمل احتیاط سے قبول کریں۔"

انہوں نے آزاد نظم میں بعض نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ اُچھوتے موضوع ہونے کے ساتھ ساتھ مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی نے ان تجربات کو ایک الگ اور انفرادی شان عطا کی ہے۔ موہنجوڈارو اور ٹھٹھہ ان نظموں میں خصوصی طور پر اہم ہیں۔ غرض کہ مختار اردو شاعری میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں اور حلقۂ اربابِ ذوق کے شعراء میں میراجی کے بعد ان کی شاعری اور اسلوب سب سے منفرد اور نمایاں ہے۔

راجہ مہدی علی خاں:-

مہدی علی خاں بطور شاعر اور ہندی فلمی گیت کار خصوصی شہرت کے حامل تھے۔ مہدی علی خاں ۲۳ ستمبر

۱۹۱۵ء کو قصبہ کرم آباد (وزیر آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق مولانہ ظفر علی خان کے خاندان سے تھا۔ اس کے علاوہ ان کی والدہ محترمہ بھی شاعری کرتی تھیں۔ لہذا ان کی پرورش ایک ادبی ماحول میں ہوئی۔ انہوں نے عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور ہندی فلموں کے لیے بطور موسیقار بھی کام کیا۔ تقسیم ہند کے بعد انہوں نے ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دی اور شہر ممبئی میں قیام کیا۔ ان کا انتقال ۱۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو ممبئی میں ہی ہوا۔ مہدی خاں برصغیر پاک وہند کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طنز و مزاح کے تیر چلانے والے شعراء میں خصوصی اہمیت کے حامل شاعر ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے ہیں۔

۱۔ مضراب

۲۔ اندازِ بیاں

۳۔ آخری نظمیں

مجموعہ "آخری نظمیں" ان کی آخری دور کی شاعری سے انتخاب کر کے پاکستان سے شائع ہوا۔ مہدی علی خاں کی شاعری زندگی کی تھکاوٹ کو دور کر کے لطافت کا احساس پیدا کرنے والے انسان کی شاعری ہے جس کا مقصد مسرتیں بانٹنا اور روحانی تسکین مہیا کرنا ہے۔

آغا(۱۴) لکھتے ہیں:

> "راجہ مہدی علی خاں کو مزاح کے میدان میں جو کامیابی نصیب ہوئی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ راجہ صاحب نے زندگی کے عام مظاہر کے چھپے ہوئے ناہموار پہلوؤں پر روشنی کا ایک نیا پرتو ڈالا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے ایک ایسے نئے مقام سے گردوپیش پر نظر دوڑائی ہے کہ شے کردار یا واقعے کے مضحک پہلوؤں کو ناظر کے سامنے پیش کیا ہے گویا مسرت کی تخلیق کی ہے اور ناظر ان کا ہم نوا بن کر ان مضحک پہلوؤں سے محظوظ ہوتا چلا گیا ہے۔"

طنز و مزاحیہ شاعری میں پیروڈی کا ان کو استاد مانا جاتا ہے۔ انہوں نے دیوانِ غالب کی تقریباً نوے فیصد غزلوں کو "غالب نامہ" میں تحریف کیا۔ مثنوی سحر البیان کی پیروڈی "مثنوی قہر البیان" لکھی۔ ان کی پیروڈیاں بے

ساختگی شگفتگی اور روانیِ بیاں کا مرقع ہیں۔ مہدی جس بھی موضوع پر پیروڈی لکھتے ہیں اس موضوع کی نفسیات اور جزئیات کا مکمل مطالعہ کرتے ہیں۔ مثنوی قہر البیان کے باب "حسینہ اور ادیب" سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

حسیں موسم تھا اور رت تھی گلابی

ہوائیں مست تھیں جیسے شرابی

رشید احمد کے گھر دعوت اُڑا کے

ہوا میں گھر میں داخل مسکرا کے

میری کٹیا میں بیٹھی تھی وہ غمگیں

کہا میں نے "ہو کیسی بلبلِ چیں"

نہ دو دن سے ملا تھا اس کو کھانا

مگر یہ راز بندے نے نہ جانا

راجہ مہدی علی خاں کی شاعری کے موضوعات پر بات کرتے ہوئے مقدر (۱۹) لکھتے ہیں:

"وہ زندگی ہی سے موضوعات چنتے ہیں اور متوسط طبقہ میں اقدار کے تغیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی نفسیات کی نبض پر ہلکے سے اپنی انگلی رکھ دیتے ہیں بلکہ ان کے طنز میں تلخی یا زہرناکی نہیں ہے۔ راجہ مہدی علی خاں کی شاعری محض خندہ آوری نہیں بلکہ بامقصد سیاسی و سماجی شعور و آگہی کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کا ایک پُر لطف امتزاج ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کو "مسرت و بہجت کی ایک مثال" قرار دیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے مسرت کو اخذ کیا ہے اور اس کے لیے بنیادی ذریعہ زندگی اور اس زندگی کے عام موضوعات کو بنایا ہے۔ فرد کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کی بہت گہری نظر ہے اور یہ ہی منفرد طرز احساس ان کو طنز و مزاحیہ شاعری کا استاد بناتا ہے۔

ن م راشد:۔

نام نذر محمد راشد یکم اگست ۱۹۱۰ء کو ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے اکال گڑھ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم اکال گڑھ سے حاصل کی اور ۱۹۲۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں گورنمنٹ کالج لائلپور سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اقتصادیات کا امتحان کامیابی سے پاس کیا۔ ۱۹۷۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ راشد کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے۔

۱۔ ماورا

۲۔ ایران میں اجنبی

۳۔ لا = انسان

۴۔ گماں کا ممکن

ن م راشد کا شمار ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے دور کی سچی ترجمانی کی اور تخلیقی سطح پر نئے رجحانات کو متعارف کروایا۔ آزاد نظم کے فروغ میں ان کا نام سرفہرست آتا ہے۔ انہوں نے آزاد نظم کی فارم کو مستقل بنیادوں پر اختیار کیا اور اس میں مختلف نئے تجربات اور رجحانات کو فروغ دیا۔ "ماورا" راشد کا پہلا نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۱ء میں چھپا۔ "ماورا" کے پہلے ایڈیشن میں چند سانیٹ اور پابند نظمیں بھی شامل تھیں مگر دوسرے ایڈیشن میں ان کو خارج کر دیا گیا۔ "ایران میں اجنبی" دوسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۵ء میں چھپا۔ اس کے موضوعات "ماورا" سے بالکل الگ ہیں اور اس مجموعہ کی فضا پر جنگ کی فضا چھائی نظر آتی ہے۔ اس مجموعے میں سامراجی قوتوں کے خلاف سخت بغاوت کا اظہار نظر آتا ہے۔ لا = انسان تیسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۹ء میں چھپا۔ اس وقت راشد اقوام متحدہ کے ریڈیو ڈویژن سے وابستہ تھے۔ اس مجموعہ کی نمایاں نظموں میں "حسن کوزہ گر"، "میرے بھی ہیں کچھ خواب"، "زندگی کی ایک پہرہ زن" "اسرافیل کی موت" وغیرہ شامل ہیں۔ "گماں کا ممکن" ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا یہ مجموعہ راشد کی زندگی میں مکمل ہو چکا تھا مگر شائع ان کی وفات کے ایک سال بعد ہوا۔

راشد کی انفرادیت پر بات کرتے ہوئے ملک (۲۰) لکھتے ہیں:

"ایک ایسے زمانے میں جب جدیدیت کے دبستانِ ادب میں فن برائے فن کے نام پر ادب و فن کو مقصدیت کی "آلائش" سے پاک کر کے رکھ دینا سب سے بڑا کارنامہ فن اور ترقی پسند ادبی تحریک کے وابستگان کے نزدیک سوویٹ روس استعمار دشمن عوامیت کی سب سے بڑی مثال قرار پاتا تھا۔ن م راشد نے دو دبستانوں کی ادبی سیاست سے انحراف کی راہ اپنائی۔"

راشد کی شاعری میں جہاں داخلیت کی فضا پائی جاتی ہے وہاں خارجیت کا پہلو بھی موجود ہے اور داخلیت اور خارجیت کا یہ امتزاج ہی ان کے فن کی نمایاں خوبی ہے۔ان کی شاعری میں آس پاس کی دنیا کے معاشرتی اور سیاسی حقائق کا بہت گہرا اور واضح اظہار ملتا ہے۔

احمد (۲۱) لکھتے ہیں:

"راشد بہت سنجیدہ شاعر ہے۔شاعری ان کے لیے ذریعہ معاش ہے نہ ذریعہ شہرت، بلکہ فقط ایک ذریعہ کاوش۔اور یہ کاوش اتنی بے لوث، اتنی بے لاگ ہے کہ اس میں کسی ادبی یا غیر ادبی تحریک سے شوق رفاقت بھی شامل نہیں، یہ آپ اپنا انعام ہے۔راشد کی اس کاوش کا دائرہ ذاتی تجربات کی دنیا تک پھیلا ہوا ہے۔"

اردو نظم کو جدید اور علمی رجحانات کا مرکز بنانے اور آزاد نظم کے موضوعات کو تنوع بخشنے میں راشد نے پہل کی ہے۔راشد کے ہاں آزادی اور بغاوت کا جذبہ بہت گہرا اور نمایاں ہے، معاشرتی معاملات سے لے کر مروجہ مذہبی اعتقادات اور مشرقی تصورِ محبت سے بغاوت اور سب سے زیادہ مغرب کے خلاف بغاوت۔

وزیر آغا (۱۴) راشد کو بغاوت کی ایک مثال قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"راشد کے کلام میں بغاوت کے ان تمام پہلوؤں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔کہیں روشن کہیں مدھم لیکن ایک چیز جو راشد کے کلام میں برقی رو کی طرح دوڑتی نظر آتی ہے وہ غیر ملکی غلبے اور ڈھلتی حکومت کے خلاف نفرت، سرکشی اور بغاوت کی رو ہے اور دراصل یہ ہی بغاوت ان کی شاعری کا اہم ترین عنصر ہے۔"

راشد کے کلام میں سے بغاوت کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

نہیں اس دریچے کے باہر تو دیکھو

خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے

اسی ساحرِ بے نشاں کا

جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں۔

(پہلی کرن)

میں نالہ شب گیر کے مانند اٹھوں گا

فریاد اثر گیر کے مانند اٹھوں گا

تو وقت سفر مجھ کو نہیں روک سکے گی

پہلو سے ترے تیر کے مانند اٹھوں گی

گھبرا کے نکل جاؤں گا آغوش سے تیری

عشرت گہ سر مست و ضیا پوش سے تیری

(رخصت)

پیش منظر اور عصری شعری منظر نامہ:

اختر حسین جعفری:

اختر حسین جعفری ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء کو ضلع ہوشیار پور کے گاؤں بی بی پنڈوری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد علی تھا جو محکمہ مال میں قانون گو تھے۔ اختر نے ابتدائی تعلیم ہوشیار پور میں حاصل کی اور پانچویں جماعت سے لے کر انٹر تک کی تعلیم گجرات سے حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد ان کے والد گوجرانوالہ آ گئے مگر اختر گجرات میں ہی رہے اور زمیندار کالج گجرات سے ۱۹۴۹ء میں انٹر کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کا امتحان گوجرانوالہ کالج سے پاس کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں ایک طویل عرصہ محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں گزارا۔ ان کا انتقال ۳ جون ۱۹۹۲ء کو شہر لاہور میں ہوا۔

ان کی شاعری کے دو شعری مجموعے ہیں:

۱۔ آئینہ خانہ (۱۹۸۱ء)

۲۔ جہاں دریا اُترتا ہے (۱۹۹۳ء)

اختر کو جدید اردو نظم نگاروں میں باشعور صوفی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے تاریخِ اسلامی کو اردو نظم میں داخل کیا اور اس کے لیے مختلف اور منفرد استعاروں کی مدد حاصل کی۔ اردو نظم کو جدیدیت کے ہمراہ کرنے کے لیے بہت سے شعراء نے فلسفہ عشق اور اسلامی تصوف کے تصورات کو صرف مثنوی اور غزل کی صنف تک محدود کر دیا تھا اور ان خیالات کو نظم کے لیے فرسودہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس صورتحال میں اور حالات میں اختر حسین جعفری نے اسلامی فلسفہ عشق اور تصوف کے تصورات کو جدید پیرائے میں ڈھال کر پیش کیا۔

قاسمی (۲۲) لکھتے ہیں:

> "۱۹۴۷ کے بعد اس پائے کا پیکر ساز اور تمثال ساز اور علامت ساز اور تراکیب ساز شاعر بمشکل ہی دستیاب ہو گا۔ یقیناً اقبال کے بعد راشد اور فیض اور مجید امجد اور ظہور کی

شاعری کئی جہات سے مثالی ہے مگر اختر کا اسلوب اظہار سب سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔"

اختر حسین جعفری کا شمار ایسے شعراء میں کیا جا سکتا ہے جنہوں نے جدید اردو نظم کی موضوعاتی توسیع میں نمایاں کردار ادا کیا اور جدید اردو نظم کو نئے اور منفرد موضوعات فراہم کیے ان کی شاعری میں اپنے دور کے جذباتی، روحانی اور فکری مسائل کا علامتی پیرائے میں اظہار جابجا نظر آتا ہے ان کی شاعری میں روایت سے بے زاری اور نفرت کی بجائے روایت کا احترام نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں کسی خاص تحریک سے وابستگی کا احساس نہیں ملتا بلکہ انہوں نے انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو بیان کیا ہے۔ جدید انسان کے داخلی کرب کو انہوں نے نہایت خوبی سے پیان کیا ہے۔

ملک (۲۳) لکھتے ہیں

"اختر نظمِ جدید کی ہئیتوں کو آزماتے وقت بھی تغزل کی روایت سے انحراف نہیں کرتا اور عارضی میں ابدی کی اور مادیت اور ماورائیت کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کے لیے مسلمانوں کی صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری سے آئینے کا استعارہ اخذ کرتا ہے۔"

چند شعری مثالیں درج ذیل ہیں:

"اے مرے غم

اے مرے غم

شہر ناقدراں کے لیے افلاک ستارے

آخر شب کی تاگا تاگا ٹوٹتی ضو میں

تری محرومی کا دکھ ہے۔"

(اے مرے غم)

جیسے ہم بے خلف سپہ ہیں

اپنے اپنے آئینے، حد پست زمانے کی جنگاہ میں

ہاتھ سے چھوٹتے تیشوں، دودھ سے خالی نہروں،

پیکر مانگتی تصویروں کے تغزیہ دار ہیں

پتھر پتھر ٹوٹتے لمحوں کے معمار ہیں

جیسے ہم خود معبد ساز ہیں

اس معبد کے خدمت گار ہیں

(شکستہ ساعتوں کے معمار)

جدید اردو نظم کے ارتقائی سفر میں اختر حسین جعفری کا ناقابل فراموش ہے اوران کی شاعری کے موضوعات منفرد اور اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی:

ڈاکٹر وحید قریشی کا اصل نام عبد الوحید اور قلمی نام وحید قریشی تھا۔ ان کے والد کا نام محمد لطیف قریشی تھا جن کا تعلق شہر گوجرانوالہ سے تھا۔ وحید قریشی کی پیدائش ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء کو میانوالی میں اپنے نانا کے گھر ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز کسووال کے پرائمری سکول سے ہوا۔ میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں پاس کیا۔ ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔ ۱۹۴۴ء میں بی اے (آنرز) فارسی، ۱۹۴۶ء میں ایم اے فارسی اور ۱۹۵۰ء میں ایم اے (تاریخ) کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد شعبہ درس وتدریس سے وابستہ ہوئے اوراس سلسلے میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں شعبہ تاریخ

کے صدر رہے۔ ۱۹۵۷ء میں اسلامیہ کالج سول لائنز میں شعبہ فارسی کے صدر رہے۔ ۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج میں بطور اردو لیکچرران کا تقرر ہوا۔ وحید اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ اس کے علاوہ اقبال اکادمی پاکستان، بزم اقبال اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے ناظم بھی رہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی بطور ادیب، ماہر اقبالیات، نقاد، محقق اور شاعر اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وحید قریشی کی پیدائش جس ادبی ماحول میں ہوئی اس نے بچپن ہی سے ان کے اندر ایک ادبی ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ کالج کے زمانے سے ہی انہوں نے مختلف کتابوں اور رسائل کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا اور اسی زمانے میں شاعری کا بھی آغاز کیا۔ "نقدِ جاں" وحید قریشی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ تقریباً ۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں نظمیں، قطعات اور غزلیں شامل ہیں۔ وحید قریشی ایک پُر گو اور بلند معیار کے شاعر ہیں اور "نقدِ جاں" میں انہوں نے متنوع موضوعات کو اپنایا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید موضوعات بھی ہیں اور ماضی کی ایک آواز بھی، نرگسیت کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی ادا اور انائیت کی گونج بھی ان کی شاعری میں سنائی دیتی ہے۔

ان کے پہلے شعری مجموعے "نقدِ جاں" کے حوالے سے سدید (۲۴) لکھتے ہیں:

> "کچھ عرصہ قبل وحید قریشی کی شاعری کی پہلی کتاب "نقدِ جاں" شائع ہوئی تو مجھے ہوں محسوس ہوا جیسے ہمالہ کے دامن سے اچانک آب صفا کا چشمہِ شیریں پھوٹ نکلا ہو۔ اہل ادب ڈاکٹر صاحب کو ایک بلند پایہ نقاد، حقیقت بین، محقق اور نقطہ جو ادیب کی صورت میں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کی سب حیثیتیں اتنی مستحکم ہیں کہ جب ان کی شاعری کی جہت سامنے آتی ہے، تو ان کی طرف حیرت سے دیکھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے شاعری کو اپنے اظہار کی غالب صنف کے طور پر قبول نہیں کیا۔ ان پر بے شمار ایسے تخلیقی لمحات وارد ہو چکے ہیں جب رموز دروں لرزتے ڈولتے، جذبوں کی متریلی چھلنی سے معطر ہو کر خود بخود اشعار کی صورت اختیار کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔"

"الواح"ڈاکٹر وحید قریشی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ۸۰ صفحات اور سات حصوں پر مشتمل ہے۔اس مجموعہ میں پنجابی کلام کے ساتھ ساتھ اردو غزلیں، نظمیں، دوہے اور طنز و مزاح شامل ہیں۔اس مجموعہ میں شامل شاعری کے حوالے سے عبدالمتین (۲۵) لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری آسمان شعر پر ایک ایسی دھنک کے متماثل ہے جس میں روح، وطن، ملت، انفس، افاق، جمال اور استمرار کو ان سات رنگوں کا اعزاز حاصل ہے جن سے یہ نظر افروز دھنک متشکل ہوئی ہے۔روح اس معتقداتی اساس کا تعین کرتی ہے جسے توحید و رسالت سے استحکام میسر آتا ہے۔جو کتاب کے نام "الواح کی وساطت سے بھی اپنے وجودِ کلیمی کا ادراک بخشتی ہے۔"

"ڈھلتی عمر کے نوحے"وحید قریشی کا تیسرا اور آخری شعری مجموعہ ہے۔یہ مجموعہ ان کی وفات سے کافی عرصہ پہلے مکمل ہو گیا تھا مگر شائع ان کی وفات کے بعد ہوا۔وحید قریشی کے شاگرد اورنگزیب نیازی نے "ڈھلتی عمر کے نوحے" کو ترتیب وانتخاب کر کے ۲۰۲۰ میں شائع کروایا۔یہ کلام بڑا بھرپور اور پُر تاثیر ہے۔اس میں دوہیں، نظمیں، غزلیات، حمد اور نعت جیسی اصناف شامل ہیں۔مزاح کے حوالے سے تحریف نگاری کے نمونے موجود ہیں۔سماجی اور معاشرتی موضوعات ان کے پسندیدہ ہیں۔اردو شاعری میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کرتے ہوئے عبدالمتین (۲۶) لکھتے ہیں:

> "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی ہمارے عہد کے جہد عالم، نامور نقاد اور مستند محقق ہی نہیں ایک ارفع سطح کے شاعر بھی ہیں اور یہ ایسی کمیاب حقیقت کا فیضان ہے کہ ہمیں ان کی دانشوانہ کارکردگی کی ہر عطا شادابی و دل پذیری کے حوالے سے پُر مایہ دکھائی دی ہے اور ہم اس پر کبھی بے آب و تاب برودت زدہ ہونے کا الزام نہیں دھر سکے اور ظاہر ہے اور اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ علم و تحقیق سے علمی وابستگی نہ رکھنا ہو تو وہ تخلیقی عمل کی ہمہ جہت پر اسراریت سے یکسر نابلد رہ جاتا ہے جس سے آگہی حاصل کیے بغیر نہ تو وہ خود کسی فن پارے کی درست فنی تحسین پر قادر ہو سکتا ہے اور نہ دوسروں ہی کو اس کی قدرت ارزانی کرا سکتا ہے۔ گویا شاعرانہ ملکہ ڈاکٹر وحید قریشی کے

وظیفہ حرف و صورت کی رعنائی و قوت کا مخفی سرچشمہ ہے اور نقد جاں آج سے کتنے
برس ادھر ان کے اسی مخفی سرچشمہ کی موجودگی کا اعلان بن کر طلوع ہوئی تھی۔"

ان کے کلام میں سے چند شعری مثالیں درج ذیل ہیں:

"کس قدر ویراں ہے میری زندگی

جیسے دیوانہ کوئی

خود کو مردہ جان لے

اور اپنی موت پر

اشک فشاں ہو اندھیری رات میں"

(زندگی)

کس کی آواز اٹھی شام کی ویرانی میں

کون پھر آتش سوزاں کو ہوا دیتا ہے

ہیر پڑھتا ہوا خاموش چراگاہوں میں

کون بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہے

(نقدِ جاں)

قطعات:

دیکھ اے گاؤں کی افسردہ و رعنا لڑکی
تیری پلکوں پہ سہمے ہوئے تابندہ گہر

میرے معصوم تخیل کی طرح نرم و حسیں
تیرے مجبور نصیبے کی طرح خاک بسر
(آنسو)

یہ تاج، یہ بہارِ ناز

یہ سنگ و خشت کا کفن

سفید مرمریں بدن

گزشتہ عظمتوں کی یاد

۔۔۔سو رہی ہے زندگی

۔۔۔رو رہی ہے زندگی

(تاج محل)

مختصر یہ کہ وحید قریشی بحیثیت شاعر اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں انہوں نے رنگارنگ تجربات کر کے ایک الگ پہچان رکھتے ہیں انہوں نے رنگارنگ تجربات کر کے ایک الگ دنیا بسائی ہے۔ انہوں نے ہر موضوع پر جامع انداز سے قلم اٹھایا اور کامیابی حاصل کی۔

جان کاشمیری:

جان کاشمیری کا شمار گوجرانوالہ کے نامور شعراء میں کیا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام محمد نصیر بٹ جبکہ قلمی نام جان کاشمیری ہے اور اسی نام سے شہرت حاصل کی۔ ان کا شمار اردو ادب کے اس واحد شاعر کے طور پر کیا جاتا ہے جس نے اردو حروف تہجی کے اعتبار سے اپنی تصانیف مرتب کی ہیں۔ اردو حروف تہجی کے اعتبار سے ان کی سولہ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان سولہ کتب کے نام درج ذیل ہیں:

۱-اعراف

۲-برجستگی

۳-پروائی

۴-تدوین

۵-ٹیس

۶-ثمر

۷-جنت میں خودکشی

۸-چاندرات والی بات

۹-حیرت سے آگے

۱۰-خلوت کے بعد

۱۱-دوزخ میں آبِ کوثر

۱۲-ڈوبتے ہاتھ کی فریاد

۱۳-ذراسی بات

۱۴-روئے غزل

۱۵-زمانے کی چھوڑو زمانہ کدھر ہے

۱۶-ژرف نگاہی

جان کاشمیری کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اردو ادب کے واحد ایسے شاعر ہیں جنہوں نے چھ، آٹھ اور دس قافیہ غزلیات کہیں، اردو کی سب سے مختصر اور طویل ترین غزل لکھنے کا اعزاز بھی ان ہی کو حاصل ہے۔ان کی لکھی ہوئی طویل غزل ۱۵۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ان کو جو انفرادی اعزازات حاصل ہیں اردو ادب کے بہت کم شعرا کو حاصل ہوئے۔ان کی کتاب "روئے غزل" میں ۱۰۴۵ مطلع جات شامل ہیں،اس کے علاوہ ان کی تین شعری کتب ایسی ہیں جو صرف ایک ہی بحر میں لکھی گئی ہیں۔کاشمیری بطور غزل گو اپنا الگ مقام رکھتے ہیں اور ان کی غزل جدید موضوعات کی آئینہ دار ہے۔انہوں نے روایات کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامک ٹرمینالوجی، جدید سائنسی حقائق سے لے کر پیچیدہ سماجی مسائل اور جدید موضوعات کو بھی اپنی شاعری میں شامل کیا۔

ان کی غزل پر بات کرتے ہوئے آغا(۲۷) لکھتے ہیں:

> "انہوں نے غزل کہتے ہوئے خود کو محض چند موضوعات میں پابند نہیں کیا اور نہ پٹے ہوئے غزلیہ اسلوب کو اپنایا ہے بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ ان لمحوں کو پابہ زنجیر کریں جو خود پر بیتے ہیں۔اصل بات یہ ہے کہ وہ اردگرد کی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے ہاتھوں سے چھونے میں کامیاب ہوئے ہیں گویا ان کے تجربات مستعار نہیں ہیں بلکہ ان کے اپنے ہیں چناچہ ان کے اکثر غزلیہ اشعار میں دل کو چھو لینے کی قدرت صاف نظر آتی ہے۔"

جان کاشمیری کی شاعری روایت وجدت کا حسین امتزاج ہے۔وہ زندگی کے عام چھوٹے چھوٹے تجربات اور واقعات سے دانش کشید کرتے ہیں اور عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی گرہوں کو اس خوبی سے کھولتے ہیں کہ غزل کی لطافت کے ساتھ ساتھ تجربات کی ہلکی سی چبھن بھی پر قرار رہتی ہے۔ان کی غزلوں کے چند اشعار اس دعوے کی تصدیق کے طور پر پیش ہیں:

یوں لمحہ لمحہ چھلکے مرا جامِ زندگی
بچے کے ہاتھ جیسے لبالب گلاس ہے

؎رہنے لگے ہیں لوگ نمک کے مکان میں
ان میں نمک حلال، مگر ایک بھی نہیں

؎بھوک فاقوں سے بغل گیر ہوئی ہے ایسے
شہر میں قحط کے آثار نظر آتے ہیں

؎میری کتاب زیست ہے بوسیدہ اِسقدر
ردی کے بھاؤ بھی خریدی نہیں گئی

؎میں خطا کار خطا ہے مری پہچان مگر
وصف انساں ہے فرشتوں کو نظر میں رکھنا

غرض کہ جان کاشمیری گوجرانوالہ کی شعری روایت میں ایک الگ انفرادیت کے حامل ہیں انہوں نے ہزاروں مشاعروں میں شرکت کر کے اپنے شہر کا روشن کیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔

عاطف کمال رانا:

گوجرانوالہ کے عصری شعری منظر نامے میں ایک اہم نام عاطف کمال رانا کا بھی ہے۔ عاطف کی موجودہ رہائش شہر گوجرانوالہ میں ہے جبکہ ان کی پیدائش ۱۸ دسمبر ۱۹۷۰ کو کوئٹہ میں ہوئی۔ تعلیم کی بات کی جائے تو میٹرک تک تعلیم مزنگ ہائی سکول لاہور سے حاصل کی، انٹر میڈیٹ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ سے کیا جبکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں ہی انہوں نے شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ عاطف کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے کو ہر لمحہ شاعری کی فضا میں ہی سانس لیتے ہیں۔ عاطف ایک جدت پسند شاعر ہیں جن کے

اسلوبِ فکر کی نمایاں خوبی فکر و شعور کی بالیدگی اور لفظوں کا تخلیقی برتاؤ ہے۔ان کی شاعری میں مضامین کا تنوع موجود ہے جو ان کو معاصر شعراء میں ممتاز کرتا ہے۔

احمد(۲۸)لکھتے ہیں:

> "شاعری تو عاطف کمال رانا پر ایک طوفانی بارش کی طرح برستی ہی چلی آرہی ہے۔ایسی طوفانی بارشیں تو ہم جیسے عام شعراء کے نظامِ اظہار کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ شاید عاطف نے اپنے اظہاری سلسلوں کا یہ نظام ایسی ہی طوفانی بارشوں کی شدتیں دیکھ کر وضع کیا ہے اور یہ نظامِ اظہار اس کی قوت متخیلہ سے بطریق احسن ہم آہنگ ہے۔"

عاطف کی شاعری میں ایک انائیہ جھنکار اورانادار لہجے کی گونج سنائی دیتی ہے۔عاطف نے غزل کے غنائی آہنگ کی بجائے کھردرے لب و لہجے میں اظہار کو پسند کیا ہے۔ان کی شاعری جدید،توانااور خوبصورت اندازِ فکر لیے ہوئے ہیں۔ان کی شاعری میں تازہ کاری اور کشادگی کا احساس ملتا ہے۔"امکان میرے ہاتھ میں"عاطف کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔جو ۲۰۰۲ میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ ۲۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اوراس میں نوے سے زائد غزلیں شامل ہیں۔یہ مجموعہ عاطف کی شاعرانہ مہارت کا منہ بولتا اظہار ہے اور فنی اعتبار اور موضوعات کے حوالے سے یہ مجموعہ کلام بے مثال ہے۔عاطف کی آنے والی کتب میں "کانچ کا پر" اور "بل کھاتی آواز"زیر طباعت ہیں۔ان کے پہلے مجموعہ کلام "امکان میرے ہاتھ میں" سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

ہمارا کارِ مشقت نہ رائیگاں نکلا
زمین کھودی تو نیچے سے آسماں نکلا
خیالِ یار ہی کام آگیا مصیبت میں
یہ تنکا میرے لئے دستِ مہرباں نکلا

شاخ سے توڑا اور اپنے امکان میں رکھ کر بھول گیا
پھولوں جیسے شخص کو میں گلدان میں رکھ کر بھول گیا
اس نے بھی جب دھیان نہ رکھا میری ذات کے ہیرے کا

میں بھی اس کو یہیں کہیں سامان میں رکھ کر بھول گیا

؎دعائیں تو سفر کرتیں ہیں مجھ سے دوقدم آگے
یہ وہ تعویذ ہیں میں نے جو بازوٗپر نہیں باندھے

؎اس کو تسخیر کر لیا میں نے
جس کے آگے تھے سب ہنر بیکار

؎کر رہا تھا صبر کی تلقین عاطف میں اُسے
نوائے مژگان سے مرا اپنا سمندر کھل گیا

تنویر قاضی:

تنویر قاضی کی پیدائش ۱۱ ستمبر ۱۹۵۵ء کو ننکانہ صاحب میں ہوئی۔ان کی موجودہ رہائش گوجرانوالہ میں ہے اور گوجرانوالہ کے عصری شعری منظر نامے میں تنویر قاضی ایک اہم مقام و مرتبہ کے حامل شاعر ہیں۔ تنویر قاضی اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر ہیں، انہیں نظم اور غزل دونوں اصناف پر یکساں مہارت حاصل ہے۔"جادو سبز ہواؤں کا"ان کی اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا۔

ان کے اس شعری مجموعے پر بات کرتے ہوئے مجید (۲۹) لکھتے ہیں:

> "جادو سبز ہواؤں کا"تنویر قاضی کے شعری سفر کا پہلا پڑاؤ ہے۔ابتدائی محبتوں کی سرشاریوں اور اولین تجربوں کی حیرتوں کے بیان میں اس کا اسلوب سادہ، سچا اور واضح ہے۔"

تنویر کی شاعری میں فکر و نظر کی تازگی اور سادگی و سلاست رواں دواں ہیں اور ان کا اسلوب سادہ ہے اس میں کوئی ابہام یا گنجلک پن نہیں۔ سادگی اور تازگی ہی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

قاضی (۳۰) لکھتے ہیں:

> "تنویر قاضی کی غزل میں سبز ہواؤں کا جادو تو بولتا ہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی نظم کے کنج میں بولتا مور بھی ہمارے اندر ناچنے لگتا ہے۔ تنویر قاضی کی شاعری ایک دھمال ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی اپنی درویش زندگی کا چولا ہمارے چاروں اور مولانا روم کے Dancing Darvesh کی طرح ہلکورے لیتا نظر آتا ہے اس لیے کہ اس کے سامنے زندگی کا ایک اور تند و تیز دریا موجود ہے اور اس میں سے تیر کر گزرنے اور پار آ لگنے کے لیے بھی اسے ایک اور ہی قسم کی محنتِ شاقہ کی ضرورت ہے اور شاید ہمیشہ رہے گی۔"

تنویر کا شمار ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے نشر و اشاعت پر زیادہ توجہ دینے کی بجائے زیادہ توجہ تکمیلِ فن پر مرکوز رکھی۔ جدید اردو نظم اور نثری نظم کے اہم شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں حسنِ اظہار کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کی تازگی ہے جو پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اثر کرتی ہے۔ ان کے کلام میں سے چند مثالیں درج ذیل ہیں:

نعت:

کبھی ایسی اسیری ہو
تیرے در کی فقیری ہو
لئے کاسۂ دل جائیں
فقیری میں امیری ہو

نظم:

بمشکل ابھی

آنکھ نے

خواب تکنا ہی سیکھا ہے

دل ہے کہ چہروں کے نیلے سمندر کی

حیرت میں گم

اور پاؤں

مسافت کی میلی گزر گاہ سے بس ذرا

آشنا

وصل کے سرمگیں دن کی خواہش میں

جاں سے گزرنا ہے

ہم نے

ابھی عشق کرنا ہے

(ابھی عشق کرنا ہے)

جادو سبز ہواؤں کا

سپنا دھوپ میں چھاؤں کا

آنکھ سفر کی خواہش میں

آگے شہر بلاؤں کا

شاہد فیروز:

گوجرانوالہ کی شعری روایت کا ایک معتبر اور اہم حوالہ شاہد فیروز بھی ہیں۔شاہد ۱۷ جنوری ۱۹۷۱ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے،ان کا قلمی اور تعلیمی نام شاہد فیروز ہے۔شاہد نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔انہوں نے لکھنے کا آغاز ساتویں جماعت سے ہی کر دیا تھا اور ابتدائی طور پر بچوں کے رسائل میں نظمیں اور کہانیاں لکھیں۔شاہد کا پہلا شعری مجموعہ "میں ہلکان سمندر" غزلوں پر مشتمل ہے اور یہ انٹرنیشل تنظیم آف لٹریری ونگ سے ایورڈ یافتہ ہے۔اس کے علاوہ سفینۂ ادب ایورڈ اور وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے تعریفی سند بھی اس کتاب کو مل چکی ہے۔جبکہ نظموں کا مجموعہ شور رہ جائے گا تکمیل کے مراحل میں ہے۔شاہد کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے بہت زیادہ تو نہیں لکھا مگر جتنا بھی لکھا باکمال لکھا۔ان کی سوش اور اسلوب میں نیاپن جھلکتا ہے۔ان کی شاعری میں بے ساختگی اور تازگی کا عنصر غالب ہے۔

؎منظر سے نگہ پھیر کے منظر نہیں مٹتے
تو لاکھ کرے نفی مرے یار مگر ہوں

؎برسوں گا اگر تجھ پر تو مٹ جائے گا صحرا
میں ابر گریزاں نہیں اِک دیدۂ تر ہوں

شاہد کی شاعری ایک جیتے جاگتے انسان کی شاعری ہے جو دنیا کو ایک الگ نظر سے دیکھنے کا ہنر رکھتا ہے،جس کا مشاہدہ وسیع ہے اور جس کے پاس تجربہ بھی ہے اور وہ دنیا میں پیش آنے والے سبھی حالات و واقعات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔

؎اُس طرف کیا ہے یہ نہیں معلوم
پار کرنا ہے مجھ کو یہ صحرا

؎مرے اضطراب کے سلسلے تری خبر ہو
تو سدا بڑھے تو سدا رہے تری خیر ہو

میں خود ہی مسافر ہوں یہاں خود ہی سفر ہوں
جادہ بھی مسافت بھی ہوں اور خود ہی نگر ہوں

شاہد فیروز کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے ان کے استاد محترم ناہید شاہد (۳۱) لکھتے ہیں:

"محمد شاہد فیروز اپنی سوچ اور فکر میں کچھ نیارا انداز اپنائے ہوئے اسلوب کی نویکلی منزلوں سے گزرتا ہے۔ کہیں وہ ردیف سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کہیں قافیے کی گونج اُس کی غزل کے مجموعی تاثر کو موثر بناتی ہے۔اس کی بعض غزلیں اپنی بے ساختگی کے باعث قاری کے باطن میں اُترتی چلی جاتی ہیں۔"

شاہد فیروز کی شاعری سماعت کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ قوتِ متخیلہ کو تحریک دینے والہ بھی ہے جو پڑھنے والے کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہے اور جس پر غور کرنے سے کئی نئے پہلو اور معانی سامنے آتے ہیں۔شاہد نے اپنی شاعری میں تجسیم کاری کو نہایت مہارت اور عمدگی سے پیش کیا ہے۔

؎پُرخواب جزیروں پہ حکومت ہے تمہاری
جو خواب بناتا ہے میں وہ دستِ ہنر ہوں

صداؤں میں صدائیں اُگ رہی ہیں
ہر شخص شور کا جنگل بنا ہے

شاہد کو ایک آفاقی شاعر قرار دیتے ہوئے ساگر (۳۲) لکھتے ہیں:

> "شاہد فیروز نے اپنی شاعری کو فقط رومانیت کلاسیکیت یا زندگی کے کسی ایک آدھ پہلو تک محدود نہیں رکھا بلکہ معاشرتی رویوں، دم توڑتی ہوئی انسانیت، ٹوٹتی بکھرتی ہوئی تہذیبوں، انسان کی اقدار و ترجیحات، طبقاتی کشمکش، محرومیاں، ناآسودگیاں، تلخیاں اور رائیگانی، عشق اور جنوں کی رفاقت اور شعور و آگہی کے کرب کی بدولت اسے عالمگیر وسعت سے ہمکنار کیا ہے۔"

غرض کہ شاہد فیروز ایک پختہ کار شاعر ہیں جن کی شاعری بہت سی خوبیوں سے مزین ہے اور دِلوں میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

گزشتہ صفحات میں گوجرانوالہ کی شعری روایت کا نہایت تفصیلاً جائزہ پیش کیا گیا ہے اور گوجرانوالہ کی شعری روایت کا پس منظر اور پیش منظر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گوجرانوالہ کی شعری روایت سے وابستہ رہے شعراء کا مختصر تعارف اور ان کے شعری مجموعات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس دوران بہت سے نئے شعراء سے بھی متعارف ہوتے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کا رنگ و روپ نکھارنے اور اسے نئے ذائقوں سے روشناس کروانے میں بھرپور حصہ لیا اور گوجرانوالہ کی شعری روایت میں اپنا ایک مقام پیدا کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ اس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گوجرانوالہ کی شعری روایت وسیع و زرخیز شعری ادبی سرمایہ رکھتی ہے اور اردو ادب میں گوجرانوالہ کے شعراء نے اپنا بھرپور حصہ ڈالا ہے۔ موجودہ دور کے کئی اہم اور نئے شاعر اسی شہر کی شعری روایت سے وابستہ ہیں اور ادب کی دنیا میں اپنی انفرادیت کے بھرپور مظاہرے کر رہے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ دہلوی، سید احمد (۲۰۱۰) "فرہنگ آصفیہ" جلد اول، طبع عکسی (بار ششم)'لاہور، کوثر پرنٹنگ کاپوریشن، ص ۱۳۰

۲۔ ابن خلدون، عبدالرحمن (۲۰۰۱) "مقدمہ ابن خلدون" کراچی، نفیس آکیڈمی، ص ۳۵۸

۳۔ فتح پوری، نیاز (دسمبر ۱۹۹۵ء) "انتقادات (حصہ اول و دوم) ۷۴واں سال، شمارہ ۱۲، ص ۳۵۷

۴۔ عبداللہ، سیّد (۲۰۱۴ء) "اشاراتِ تنقید" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۳۶

۵۔ بریلوی'عبادت (۱۹۸۹) "شاعری کیا ہے" لاہور، ادارہ ادب و تنقید'ص ۹

۶۔ حالی، الطاف حسین (۲۰۰۱) "مقدمہ شعر و شاعری" لاہور، خزینہ علم و ادب، ص ۳

۷۔ قاضی، محمود احمد (۲۰۱۵ء) "یہ گوجرانوالہ ہے" لاہور'جمہوری پبلی کیشنز، ص ۶۱، ۱۳

۸۔ لاہوری، غلام سرور (۱۸۷۷ء) "تاریخِ مخزنِ پنجاب" لکھنو، کتب خانہ طبیب، ص ۲۶۴

۹۔ شیخ، اسد سلیم (۲۰۱۶) "نگر نگر پنجاب" لاہور، فکشن ہاؤس، ص ۲۶۲

۱۰۔ علوی، ایم اے (سن ن د) "جغرافیہ پاکستان" کراچی، الائیز بک کارپوریشن، ص ۱۸۹

۱۱۔ زیدی، نظیر حسنین (۱۹۸۶) "مولانا ظفر علی خاں—احوال و آثار" لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۷۵

۱۲۔ زکریا، خواجہ محمد (۲۰۱۲ء) "تاریخ ادبیات (جلد پنجم)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ص ۱۲۵

۱۳۔ آغا، وزیر (1977ء) "اردو ادب میں طنز و مزاح" لاہور، مکتبہ عالیہ، ص ۳۳۲

۱۴۔ آغا، وزیر (۲۰۱۸ء) "نظمِ جدید کی کروٹیں"، لاہور، سنگت پبلشرز، ص ۱۱۱، ص ۱۴۹، ص ۴۹

۱۵۔ ظفر، یوسف (۱۹۴۴ء) دیباچہ، "زہر خند" لاہور، مکتبہ اردو، ص ۱۲

۱۶۔ صدیقی، مختار (۱۹۵۵ء) مقدمہ، "منزلِ شب" لاہور، مکتبہ نیا ادارہ، ص ۱۰

۱۷۔ ملک، فتح محمد (۱۹۹۱ء) "تعصبات" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۳۰۲

۱۸۔ سعید، سعادت (جولائی ۱۹۹۰ء) "جدید اظہار اور منزلِ شب" مشمولہ "مقالات حلقۂ اربابِ ذوق" مرتبہ سہیل احمد، لاہور، پولی مر پبلی کیشنز، ص ۲۱۸

۱۹۔ مقدر، عبد القدیر (۲۰۰۶ء) "راجہ مہدی علی خاں کی ادبی خدمات" نظام آباد، اندور آفسٹ پرنٹرس پھولانگ، ص ۲۳۳

۲۰۔ ملک 'فتح محمد (۲۰۱۰ء) "راشد کی سامراج دشمنی" مشمولہ مجلّہ "بنیاد (راشد نمبر)" مدیران یاسمین حمید، معین نظامی، لاہور، گورمانی مرکز زبان و ادب لمز یونیورسٹی، ص ۷۰

۲۱۔ احمد'آفتاب (۱۹۸۶ء)"شاعروں کا شاعر ــــراشد"مشمولہ ن۔م۔راشد۔ایک مطالعہ"مرتبہ"جمیل جالبی"کراچی،مکتبہ اسلوب،ص۸۸

۲۲۔ قاسمی،احمد ندیم (۱۹۹۳ء)پیش کلام"جہاں دریا اُترتا ہے"از اختر حسین جعفری،لاہور،فروا پبلشنگ ہاوس،ص۹

۲۳۔ ملک،فتح محمد(۱۹۵۵ء)"تحسین وتردید"لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،ص۲۳۴

۲۴۔ سدید،انور(۱۹۸۱ء)اختتامیہ فلیپ"الواح"از ڈاکٹر وحید قریشی،فیصل آباد،طور پرنٹنگ پریس، ص۷۵ تا۷۶

۲۵۔ عبد المتین،عارف(۱۹۸۴ء) فلیپ،مشمولہ"الواح"از ڈاکٹر وحید قریشی،فیصل آباد،طور پرنٹنگ پریس،ص۹

۲۶۔ عبد المتین،عارف (جنوری،فروری ۲۰۰۷ء)"ارفع سطح کے شاعر"مشمولہ"ماہنامہ چہار سو"جلد نمبر ۱۴،مدیر،سید ضمیر جعفری،روالپنڈی،فیض اسلام پرنٹنگ پریس،ص۲۸

۲۷۔ آغا،وزیر(۱۹۸۷ء)دیباچہ،مشمولہ"اعراف"ازجان کاشمیری،گوجرانوالہ،مکتبہ قرطاس،ص۱۴

۲۸۔ احمد،خالد(۲۰۰۲ء)"ذکر ایک طوفانی بارش کا"مشمولہ"امکان میرے ہاتھ میں"از عاطف کمال رانا،گوجرانوالہ،فروغ ادب اکادمی،ص۲۱

۲۹۔ ریاض،مجید(۱۹۹۹ء)"تنویر قاضی کا اظہار نامہ"مشمولہ"جادو سبز ہواؤں کا"از تنویر قاضی،فیصل آباد، شرکت پریس ہم خیال پبلیشرز،ص۱۱

۳۰۔ قاضی،محمود احمد(۱۹۹۹ء)فلیپ"جادو سبز ہواؤں کا"از تنویر قاضی،فیصل آباد،شرکت پریس ہم خیال پبلیشرز

۳۱۔ شاہد'ناہید(۲۰۱۵ء)دیباچہ،مشمولہ"میں ہلکان سمندر"از شاہد فیروز،گوجرانوالہ،بن ہاشم پبلیکشنز،ص۱۱

۳۲۔ ساگر،شیراز(۲۰۱۵ء)"شاہد فیروز۔۔۔ایک آفاقی شاعر"مشمولہ"میں ہلکان سمندر"از شاہد فیروز، گوجرانوالہ،بن ہاشم پبلیکشنز،ص۱۴۹

باب دوم

میجر (ر) شہزاد نیّرؔ۔۔احوال و آثار

سوانح

شخصیت

تصانیف

شہزاد کی ترجمہ نگاری اور تنقید نگاری

باب دوم

شہزاد نیّر۔۔۔احوال و آثار

حسن آغاز:

کسی بھی شاعر یا ادیب کے سوانحی حالات اور پس منظر کو جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے اس شاعر یا ادیب کے فن کو جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ایک شاعر یا ادیب صرف ایک شاعر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بھی ہوتا ہے،اس کے علاوہ ان پر کچھ گھریلو اور خاندانی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں اور کسی بھی تخلیق کار پر اس کے ماحول اور خاندان کا گہرا اثر بھی ہوتا ہے۔ایک تخلیق کار اپنی تخلیقی کاوشوں کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کو بھی بہ حسن وخوبی نبھاتا ہے،اسی طرح ایک شاعر یا ادیب کے سوانحی حالات اس کے فنی اُتار چڑھاؤ میں گہرا کردار ادا کرتے ہیں اور ان سوانحی حالات کو جاننے سے اس شاعر یا ادیب کے فن کی تفہیم اور تشریح آسان ہو جاتی ہے،کیونکہ تخلیق کار معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے اور وہ زندگی کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔

سوانحی حالات:

تاریخِ ادب میں بہت سے نامور شعراء وادبا کا تعلق عسکری شعبے سے رہا ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر کا تعلق فوج کی سول سروسز اور آرمی ایجوکیشن کور کے شعبہ سے تھا جیسا کہ چراغ حسن حسرت،فیض احمد فیض،صدیق سالک،ضمیر جعفری وغیرہ۔لیکن فوج میں بطور لڑاکا فوجی اپنی خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو برقرار رکھنا اوران کا بھرپور اظہار بھی کرنا قدرے مشکل کام ہے۔شہزاد نیّر کا شمار ان ہی تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے بطور لڑاکا فوجی اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بھی خوب آبیاری کی۔شہزاد نیّر کا نام محمد شہزاد، تخلص نیّر اور شہزاد نیّر قلمی پہچان ہے گھر میں سب پیار سے "شاد" پکارتے ہیں۔ان کی تاریخ پیدائش رجسٹر پیدائش کے اندارج کے مطابق ۲۹ مئی ۱۹۷۳ ہے جبکہ ان کی تمام تعلیمی اسناد کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۴ اپریل ۱۹۷۳ ہے۔وہ گوجرانوالہ کے ایک قصبہ گوندانوالہ میں پیدا ہوئے۔ان کے

آباءواجداد زراعت پیش تھے اور بنیادی طور پر محنت مشقت کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ صنعتوں کے آغاز کے بعد ان کا خاندان صنعتوں کے شعبے سے منسلک ہوا تو ان کے معاشی حالات میں کافی حد تک بہتری آ گئی۔ شہزاد کے والد کا نام محمد رفیق اور والدہ کا نام صغریٰ بی بی ہے۔ ان کے چھ بہن بھائی ہیں اور بہن بھائیوں میں شہزاد کا نمبر دوسرا ہے۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ ۲۹ مئی کو محمد رفیق اور صغریٰ بی بی کے آنگن میں کھلنے والا یہ پھول ایک دن اپنی مہک سے پورے گلستانِ ادب کو معطر و خوشبودار کر دے گا اور اپنے خاندان کے لیے عزت و تکریم میں اس قدر اضافہ کا باعث ہو گا۔ شہزاد کے والد ایک جفاکش اور محنتی انسان تھے جنہوں نے اپنے بچوں کے لیے زندگی کی دھوپ چھاؤں میں کڑی محنت کی۔ ان کے والد نے ایک فیکٹری میں ملازمت سے آغاز کیا تھا اور ایک عام مزدور کی طرح زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے میں جتے رہے لیکن اپنی وہ اپنی طویل محنت و جدوجہد کے نتیجہ میں گوجرانوالہ کی ایک آئرن فیکٹری کے مالک بن گئے تھے۔ ان کے والد کا انتقال ۱۳ اپریل ۲۰۲۱ء کو ہوا۔

والد کے حوالے سے بات کرتے ہوئے نیّر (ا) کہتے ہیں:

> "والد بہت محنتی انسان رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری خاطر بہت کٹھن حالات کا سامنا کیا۔ ایسا بہت کم ہوا کہ والد سے مار پڑی ہو"

شہزاد کی والدہ پردہ دار، نیک سیرت اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ اس نیک سیرت ماں نے بچپن سے ہی اپنے بچوں کو خوش اخلاقی اور غمگساری کا درس دیا۔ والدہ بہت محنتی تھیں اور بچوں کی تربیت کی تمام تر ذمہ داری ان پر تھی۔ شہزاد کی تربیت کا تمام تر سہرا ان کی والدہ کے سر ہے اور شہزاد کی پڑھائی لکھائی کا بھی اصل محرک ان کی والدہ ہی ہیں۔

والدہ کے متعلق بات کرتے ہوئے نیّر (ا) کہتے ہیں:

> "والدہ بہت ہمدرد اور غمگسار خاتون تھیں۔ ذہانت اور دانشوری ان میں بہت تھی، چرخہ کاتتی تھیں، مرغیاں پالنا، آزار بند بُننا، کڑھائی اور کروشیے کا کام بہت شوق سے کرتی تھیں۔"

ان کی والدہ پڑھی لکھی تو نہیں تھیں لیکن بچوں کی پڑھائی پر خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ محلے میں اپنی سمجھ داری اور معاملہ فہمی کی وجہ سے جانی جاتی تھیں اور محلے کی تمام خواتین اپنے گھریلو امور کے لیے ان سے مشورہ اور مدد لیا کرتی تھیں۔ والدہ ایک عقل مند اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔

والدہ کے متعلق عائشہ "بہن"(۲) کہتی ہیں:

> "والدہ بہت سادہ مزاج تھیں لیکن ان میں زندگی کے معاملات کو سمجھنے کا بہت فہم تھا۔ بچوں پر بہت پکڑ رکھتی تھیں۔ اردو اور اسلامیات کا سبق خود سنتی تھیں اور چوتھی جماعت تک ریاضی بھی پڑھا لیتی تھیں۔ صفائی ستھرائی کا انہیں بہت شوق تھا۔ بچوں کو اور گھر کو سجا سنوار کر رکھتی تھیں۔"

والدہ کا انتقال جولائی ۱۹۹۸ء کو ہوا۔ شہزاد اس وقت "رٹو" ضلع استور میں ٹریننگ کر رہے تھے، جب تک شہزاد پہنچتے والدہ کی تدفین ہو چکی تھی۔ یہ اندوہناک خبر اور صدمہ شہزاد کے لیے ایسے ہی تھا کہ جیسے سر سے آسمان کا سایہ اُٹھ گیا ہو۔ والدہ کی وفات کے بعد ایک خواب دیکھا اور اس کے حوالے سے مشہور نظم ''اُفق کے پار جانے والے آنسو'' لکھی جو کہ ان کے شعری مجموعہ برفاب میں شامل ہے۔

اُفق کے پار جانے والے آنسو

سفید آنچل کے ایک کونے میں

میرے آنسو سنبھال کر اس طرح وہ بولی

نہ ایسے رونا

اے میرے بچے!

یہ زندگی۔۔۔نام ہے دکھوں کا

تمہارے آنسو مرے جگر پر ٹپک پڑے ہیں

نہ ایسے رونا

اے میرے بچے!

میں روتے روتے ہی سو گیا تھا

اُفق کے اس پار سے مری ماں

مرے دُکھوں پر اداس ہو کر

مری تسلی کو آن پہنچی

وہی مقدس، ندیم آنکھیں

رحیم آنکھیں، کریم آنکھیں

اُفق کے اس پار سے جو مجھ کو

بڑی محبت سے دیکھتی ہیں

مری نگاہوں سے دور

لیکن مرے دُکھوں کی نمی سے جھلمل

وہ میرے اشکوں کو اپنے پلو میں باندھ کر

آسماں کے اس پار لے گئی ہے

یہ لوگ کہتے ہیں، مائیں مرتی نہیں

مائیں مر کر بھی جاگتی ہیں

جو بچے روئیں تو سوتی کب ہیں!!(۳)

شہزاد کے دو بھائی اور چار بہنیں ہیں جن کے نام فرزانہ کوثر، شہباز احمد، سمیرا سلیم، صائمہ عرفان، خرم اعجاز اور عائشہ احد ہیں۔ تمام بہن بھائی شادی شدہ ہیں اور خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ بچپن سے ہی شہزاد کے گھر کا ماحول مذہبی اور سادہ تھا۔ گوجرانوالہ کے ایک گاؤں گوندلانوالہ میں ان کا بچپن گزرا اور اس ہی ماحول میں شہزاد نے بچپن اور لڑکپن کی منزلیں طے کی۔ کسی مفکر نے کیا خوب کہا ہے کہ شہر انسان نے بنائے لیکن دیہات خُدا نے بنائے ہیں۔ دیہات پر خدا تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہوتا ہے اور دیہات میں فطرت کے حقیقی اور دلکش نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایسے ہی فطری اور خوبصورت ماحول میں شہزاد کی پرورش ہوئی۔ بچپن میں شہزاد قدرے شرارتی اور چلبلے مزاج کے تھے۔ بچپن کا ایک واقعہ بیان شہزاد (۴) اپنے ایک انٹرویو میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "میرا بچپن گاؤں میں گزرا جس میں بھینسوں کو اچار ڈالنا وغیرہ شامل ہے ہاں ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ گاؤں میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ جب بارش نہ ہو رہی ہو تو کسی بزرگ پر پانی پھینکا جائے تو بارش ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بزرگ پر ابھلا کہتا ہے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ گرمی شدید تھی تو ہم نے بالٹیوں میں پانی بھرا اور لوگوں پر ڈالنا شروع کر دیا ایک اماں جی بھی آئیں تو ہم نے ان پر پانی پھینک دیا تو وہ وہیں بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں کہ میں نے کسی کے گھر جانا تھا اب میرے کپڑے سکھاؤ وہ ہنس بھی پڑی۔"

شہزاد اپنے دادا کے ساتھ گہری انسیت اور محبت رکھتے تھے۔ ان کے دادا کو بہت سی پنجابی اور صوفیانہ شاعری یاد تھی اور وہ ان کافیوں کو پڑھتے رہتے تھے۔ یہی سے شہزاد کی شاعری سے واقفیت ہوئی اور ان کے اندر شاعرانہ ذوق پروان چڑھا اس کے علاوہ گاؤ ں کے فطری اور رومان پرور ماحول، صبح کی تازہ ہوا، ماحول کی ٹھنڈک، فصلوں بھرے کھیت اور خوشبودار پھل اور پھول یہ سب وہ عناصر ہیں جنہوں نے شہزاد کو قدرت اور شاعری کے قریب کیا۔ بچپن کا یہ قدرتی ماحول اور فطرت کی رنگینی شہزاد نے شاعرانہ مزاج کی ضامن ہے۔

بچپن کی چند عادات پر شہزاد (۱) کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> "بچپن میں کھیلنے اور گھومنے پھرنے کا شوقین تھا۔ دوستوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ گھل مل کر رہتا تھا کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ جب کسی بات پر دل رنجیدہ ہوتا تو introvert بھی ہو جاتا تھا۔ کوئی بھی واقعہ ہوتا تو ذہن پر اس کا گہرا اثر طاری ہو جاتا

تھا۔ اکیلے میں قدرتی مناظر بہت شوق سے دیکھتا تھا۔ پرندوں کی آوازیں سننا اور قدرتی مناظر بہت شوق سے دیکھتا تھا۔"

دوستوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ وقت گزارنا شہزاد کو بہت اچھا لگتا تھا اس لیے بچپن کے ان دنوں میں دیہات میں کھیلے جانے والے کھیل مثلاً گلی ڈنڈا، چور سپاہی، پتنگ اُڑانا وغیرہ بھی شوق سے کھیلے۔ شہزاد اپنے مزاج کی سادگی اور نرمی کے ساتھ انسان دوست آدمی ہے اور ان کی شخصیت کا متاثر کن پہلو ان کا دوستوں کے ساتھ رویہ بھی ہے۔ ان کی شخصیت میں لوگوں کے لیے محبت، خلوص اور ہمدردی کا جذبہ وافر مقدار میں موجود ہے۔

بچپن کے دوستوں کے حوالے سے نیّر (۱) بیان کرتے ہیں:

"بچپن کے چند دوست جن سے آج بھی رابطہ برقرار ہے ان میں راشد محمود، عرفان یوسف اور عرفان قمر شامل ہیں۔ ان میں عرفان یوسف پولیس میں کانسٹیبل ہے اور عرفان قمر کا قیام دبئی میں ہے۔ باقی بچپن کے دوست ان ہی گلیوں میں چھوٹ گئے۔"

بچپن کے وہ خوبصورت دن اور یادیں آج بھی شہزاد کے ذہن میں تازہ ہیں اور ان کو مسرور و اداس کرتی رہتی ہیں۔ وہ اپنے انٹرویوز اور باتوں میں ان یادوں کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں۔

ان خوبصورت یادوں پر بات کرتے ہوئے نیّر (۵) کہتے ہیں:

"مجھے وہ ننّھا سا لڑکا شہزاد بہت یاد آتا ہے جو بستہ اُٹھائے سرسبز کھیتوں کی پگڈیوں پر چلتا ہوا سکول جایا کرتا تھا۔ درخت، پھول اور پرندے اس سے باتیں کرتے تھے۔"

شاعری کا آغاز:

شعر و ادب سے شہزاد نیّر کا تعلق بہت گہرا اور پرانا ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول اور فطرت نے شہزاد کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ اور سنجیدگی پیدا کر دی اور وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کے عادی ہوئے۔ سکول کے زمانے سے ہی ان پر شعری آمد کا آغاز ہو گیا تھا اور وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ اگلی جماعت میں پہنچتے ہی اردو کی شامل نصاب کتاب میں موجود شاعری کا حصّہ سب سے پہلے پڑھ لیتے تھے بلکہ اگلی جماعتوں کی کتابوں

میں شامل شاعری بھی پڑھ لیتے تھے۔اسی طرح شاعری سے لگاؤ گہرا ہوتا گیا۔نیّر تخلّص بھی سکول کے زمانے میں شفیع الدین نیّر کی نظمیں پڑھ کر اور ان سے متاثر ہو کر اختیار کیا۔

اس حوالے سے نیّر (٦) بیان کرتے ہیں:

> "ساتویں میں پڑھتا تھا کہ شعر کہنے لگ گیا خود ہی راغب ہوا پہلا اظہار ہوا اور وہ بھی نظم میں۔۔۔ نظم نظام تعلیم کے بارے میں تھی۔۔۔البتہ اس کے کچھ دن بعد ایک غزل کہی تھی یہ غزل انہی دنوں نوائے وقت میں شامل ہوئی تھی۔نثر پڑھی بہت لکھی کم۔ذائری شوق سے لکھتا تھا اور شاعری اس لیے خوش آئی کہ اس میں کم کہہ کر بہت کہا جا سکتا ہے۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شہزاد نے شاعری کا آغاز بہت بچپن سے ہی کر دیا تھا اور اپنی پہلی نظم اپنے عربی کے استاد پر لکھی جنہوں نے ایک معمولی سی بات پر شہزاد کو سزا دی تھی اس سزا کے رد عمل کے طور پر انہوں نے ایک نظم لکھی۔ نظم کچھ یوں تھی:

اخبارات میں چھپتے ہیں ہر روز اداریے
پیش کرتا ہے ہر کوئی اپنے اپنے نظریے
موردِ الزام ٹھہراتا ہے کوئی حکومت کو
کسی کی نظر میں غلط ہیں عوام کے رویے
شہزاد کی نظر میں ہے قصور وار استاد
کہ ہے مزاج جس کا چڑچڑے پن سے برباد
بے سبب مارتا رہتا ہے بچوں کو
یاد آتا نہیں اسے یومِ حساب
برا ہو استاد تو ملک ہو گا برباد
اچھا ہو استاد تو ملک بھی ہو گا شاد

یہ نظم شہزاد کے گہرے شعور کی طرف ایک پہلا قدم یا اشارہ ہے اوران کی طبیعت کی حِساسیت کو واضح کرتا ہے کہ وہ معاشرے میں ہونے والے کسی عمومی واقعے یا حادثے کی وجہ کو بھی کس قدر گہرائی میں جا کر سوچتے ہیں اور اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی پہلی غزل جو انہوں نے لگ بھگ آٹھویں یا نویں جماعت میں لکھی اور نوائی وقت میگزین میں چھپی بھی کچھ اس طرح ہے۔

وہ جس دن کا مجھ سے جدا ہو گیا ہے
دریچہ محبت کا وا ہو گیا ہے
چلے جا رہے ہیں میرے سارے اپنے
الہیٰ یہ کیا ماجرا ہو گیا ہے
جو نخوت سے میری گلی میں وہ آیا
تو زخموں کا جنگل ہرا ہو گیا ہے
ہوئی ساری بستی میری جاں کی دشمن
مرا اس پہ مرنا خطا ہو گیا ہے
رہی زندگی میں نہ اب دل نشینی
کہ نیّر کا دلبر خفا ہو گیا ہے

شہزاد کی یہ پہلی غزل ان کے تخیل کے رومانوی پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتی ہے کہ شاعر کسی مخصوص موضوع کے تحت ہی نہیں لکھتا بلکہ وہ اپنی شاعری میں زندگی کے تمام موضوعات پر روشنی ڈالتا ہے۔بطور انسان وہ دکھی بھی ہوتا ہے اور خوش بھی، کسی کے لیے خوشی کا باعث بھی بنتا ہے، کسی کے لیے خوبصورت و دلکش جذبات بھی محسوس کرتا ہے اور ان کا اظہار بھی کرتا ہے۔ان کی پہلی نظم و غزل گواہ ہے اس بات کی کہ شعر وادب کے میدان میں ان کی آمد تہلکہ خیز ثابت ہونے والی ہے۔

شہزاد نے شعری تخیل کو پروان چڑھانے میں نہایت صبر و تحمل اور ااستقلال سے کام لیا۔زندگی کے کٹھن سے کٹھن حالات اور ملازمت کے سخت ترین دور میں بھی انہوں نے شاعری کو اپنا ذریعہ اظہار بنائے رکھا

ہے۔ساتویں میں شاعری کا آغاز ہوا اور دسویں کے امتحانات کے فوری بعد ہی شہزاد نے ماجد الباقری سے اصلاحِ سخن لینا شروع کر دی تھی۔ماجد الباقری گوجرانوالہ کے ایک معروف شاعر گزرے ہیں۔شہزاد نے شاعری کے اسرار و رموز اور گہری باتیں ان ہی سے سیکھی۔یہ اصلاح و مشورہ خط و کتابت کے ذریعے اور بالمشافہ ملاقات سے بھی ہوتا تھا۔۱۹۹۴ء میں جان کاشمیری کے انتقال کے کچھ سال بعد جان کاشمیری صاحب سے مشورہ سخن کیا اور ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ان کی شاگردی میں شہزاد کی شاعری کا حسن مزید نکھر کر سامنے آیا۔

شہزاد کی رسمی تعلیم:

علم حاصل کرنا ہر انسان کی معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔شہزاد کے والدین نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔دیہاتی ماحول اور پس منظر رکھنے کے باوجود ان کی والدہ نے شہزاد کی تعلیم پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔مقامی اور خاندانی رواج کے مطابق رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی اور قرآن مجید کی تعلیم کے لیے شہزاد کو مدرسہ میں داخل کروادیا گیا۔میٹرک تک تعلیم انہوں نے گاؤں کے ہائی سکول سے حاصل کی۔۱۹۸۹ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول گوندانوالہ سے شاندار نمبروں سے پاس کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ان کا تعلیمی ریکارڈ ہمیشہ شاندار رہا اور انہیں پڑھنے لکھنے کا جنوں کی حد تک شوق تھا۔انٹر میڈیٹ کی تعلیم کے لیے ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور وہاں انہیں مختلف اور نئے ماحول کا سامنا کرنا پڑا۔

کالج کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں نیّر (۷) بیان کرتے ہیں:

> "اپنے گاؤں سے میٹرک کرنے کے بعد میں نے ایف ایس سی کے لیے ایف سی کالج میں داخلہ لیا۔میں وہاں پر ہوسٹل میں رہتا تھا۔شروع شروع میں جو چیز مجھے بڑی عجیب محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ مثلاً کیمسٹری بلاک ایک طرف ہے، فزکس بلاک اس سے دور دوسری طرف ہے۔مزید کچھ فاصلے پر ڈی بلاک تھا وہاں انگلش کی کلاس ہوتی تھی۔پھر نیو بلاک تھا جہاں اردو پڑھنے جاتے تھے۔وہاں سے بیالوجی بلاک کافی دور تھا۔جب ایک کلاس ختم ہوتی تو اس کے بعد اگلے بلاک کی طرف دوڑ لگ جاتی۔اس وقت ایف سی میں صرف گریجویشن کے بعد مخلوط تعلیم تھی۔ڈی بلاک کی طرف جاتے ہوئے دل گنگناتا تھا اور واپسی پر دل روتا تھا کیوں کہ وہاں اکثر پیاری پیاری لڑکیاں نظر آتی تھیں۔ہم ڈی

بلاک کی طرف زیادہ ہی بھاگ کر جاتے اور پیریڈ ختم ہونے کے بعد آہستہ آہستہ
نکلتے تھے۔ یہ قدرتی کشش تھی جو سائنس کے کسی فارمولے میں نہیں آسکے گی۔"

کالج کی زندگی نے ان کی شاعری کو خوب جلا بخشی۔ ایف سی کالج میں ہونے والے مشاعروں میں انہوں نے خود بھی شرکت کی اور عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، احمد عقیل روبی اور جعفر بلوچ جیسے شعراء کو بھی براہ راست سنا اوران سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ لیکن وہ ایف سی کالج میں زیادہ عرصہ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نا رکھ سکے اور انہوں کے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں مائیگریٹ کروالیا۔ جہاں سے انہوں نے ۱۹۹۱ء میں ایف ایس سی کی تعلیم مکمل کی۔ شہزاد نے کالج کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصّہ لیا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں تقاریر، سپورٹس کے مقابلے، لانگ جمپ ایونٹ اور مشاعروں میں انہوں نے خوب شرکت کی۔ ایف ایس سی مکمل کرنے کے بعد اُنہوں نے آرمی میں درخواست جمع کروادی اور ساتھ ہی گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں بی ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں انہیں سجاد مرزا جیسے اساتذہ کا فیض حاصل ہوا۔ حالات کی تبدیلی اور زندگی کے متضاد رویوں نے انہیں فلسفے اور سماجیات کو سمجھنے میں مدد دی۔

نیّر (۸) بیان کرتے ہیں:

شہری اور دیہاتی زندگی کے گہرے تضّاد کے ساتھ ساتھ امیری غریبی کے تضّاد کا بھی
شدید احساس ہوا اور میں اکثر اس تضّاد پر غور کرتا رہتا۔ کالج میں داخلہ لینے سے پیشتر
میں نے پینٹ نہیں پہنی تھی کالج میں آکر پتلون پہنی۔۔۔۔۔ حالات کی تبدیلی کے
سبب جس متضاد صورت حال کا شکار ہوا تھا اس نے مجھے بہت حسّاس بنا دیا میرا مطالعہ کا
رجحان بڑھ گیا اور میں فلسفہ کی طرف راغب ہو گیا۔"

گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں جاکر شہزاد کے روابط مختلف ادباء اور شعراء سے استوار ہونے اور گوجرانوالہ کی ہفت روزہ تنقیدی نِشستوں میں ایک سامع کی حیثیت سے شریک ہوتے رہے۔ فوج میں سلیکشن ہو جانے پر بی ایس سی کو ترک کر دیا اور پاک فوج میں شمولیت اختیار کرلی اور گریجویشن ۱۹۹۵ء میں پاک ملٹری اکیڈمی میں ٹریننگ کے دوران مکمل کی۔ فوج کے بے شمار محکمانہ اور پروفیشنل کورسز کے ساتھ ساتھ شہزاد نے تعلیم سے اپنا رشتہ توڑا اور ۲۰۰۵ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں ایم اے اردو پاس کیا۔ اس کے بعد ۲۰۱۱ء میں پنجاب

یونیورسٹی سے ایم اے ابلاغیات کیا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ابلاغیات میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ سکول کے زمانے سے ہی انہیں عربی اور فارسی زبان سے گہری دلچسپی تھی اور سکول کے زمانے سے ہی انہیں عربی اور فارسی زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔ اپنے اس رجحان کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے نمل یونیورسٹی سے فارسی زبان وادب میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔

شہزاد کو بچپن سے ہی مطالعہ کی عادت اوراس سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ انہوں نے سخت سے سخت حالات میں بھی اس عادت پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔ بچپن میں ان کی پھوپھو خواتین کے رسالے کافی دلچسپی سے پڑھتی تھیں۔ شہزاد کو درسی کتب کے علاوہ یہ ڈائجسٹ ہی میسر ہوتے تھے جس سے وہ اپنے علم کی پیاس کو خوب سیر اب کرتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں انہوں نے پروین شاکر کی "خوشبو" پڑھی۔ اس زمانے میں امرتا پریتم ان کو بہت پسند تھیں شہزاد نے ان کی شاعری اور نثر دونوں کو خوب پڑھا۔

علم اورادب سے اپنی محبت کو نیّر (۹) کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> "تعلیم کا علم سے بہت تھوڑا تعلق ہوتا ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے تو میں کتابیں پڑھتا ہوں اورآپ نے ٹھیک کہا کہ اس تعلیم حاصل کرنے کا میری جاب کو بھی فائدہ نہیں ہے۔ یہ ڈگریاں تو تعلیم سے متعلقہ ہیں۔ بس یہ خواہش تھی کہ میں کچھ سیکھ لوں اور اچھے ماحول سے کچھ تربیت حاصل کر سکوں۔"

دورانِ ملازمت بھی شہزاد نے بہت زیادہ مطالعہ کیا۔ عالمی ادب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے کلاسیکل شعراء کو بھی غور سے پڑھا۔ کلاسیکل شعراء میں میر تقی میر، خواجہ حیدر علی آتش، امام بخش ناسخ اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کا انتخاب کیا۔ اگرچہ اس سے پہلے دیوانِ غالب کا مطالعہ تو وہ ساتویں جماعت میں ہی کر چکے تھے۔ سٹیفن ہاکنگ کی کتاب "وقت کی تاریخ" نے شہزاد کی ذہنی اپروچ کو بدلنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا اوران کا اس بات پر اعتقاد مضبوط ہو گیا کہ کوئی بات کوئی سچ یا کوئی نظریہ حتمی نہیں ہے اور تضّاد ہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اگرچہ شہزاد کا گھرانہ مذہبی ماحول رکھتا تھا اوران کا تعلق حنفّی بریلّوی مکتبہ فکر سے تھا مگر شہزاد کے ذہن

میں میٹرک کے زمانے سے ہی مختلف مسالک کے تقابل کی ایک فکر پیدا ہو چکی تھی اور اس سے ہی ان میں دوسرے مذاہب کو جاننے کا شوق پیدا ہوا۔

نیّر (۱) بیان کرتے ہیں:

> "بذریعہ ڈاک بائبل کے کچھ کورّس کیے اور دوسرے مذاہب کا مطالعہ کیا۔ اس سارے مطالعے سے ذہن میں بہت کشادگی پیدا ہوئی اور دل میں دوسرے لوگوں کے عقائد و نظریات کے متعلق احترام پیدا ہو گیا کہ جتنے ہمیں اپنے عقائد عزیز ہیں اتنے ہی دوسروں کو ان کے عزیز ہیں۔"

ملازمت:

تاریخِ ادب میں بہت سے نامور اُدبا و شعراء کا تعلق عسکری شعبے سے رہا ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر کا تعلق فوج کی سول سروسز اور آرمی ایجوکیشن کور کے شعبہ سے تھا جیسا کہ چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض، صدیق سالک، ضمیر جعفری وغیرہ۔ لیکن فوج میں بطور لڑاکا فوجی اپنی خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو برقرار رکھنا اور ان کا بھرپور اظہار بھی کرنا قدرے مشکل کام ہے۔ شہزاد نیّر کا شمار ان ہی تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے بطور لڑاکا فوجی اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بھی خوب آبیاری کی ہے۔ ایک بہترین انسان اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شہزاد ایک بہترین فوجی بھی ہیں جنہوں نے اپنے وطن کے سبز ہلالی پرچم کی آن، بان، شان اور دفاع کے لیے عظیم قربانیاں پیش کی۔ مئی ۱۹۹۳ء میں شہزاد نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ آرمی میں آنے کا شوق ان کو بچپن سے ہی تھا۔

اپنے اس شوق کے متعلق نیّر (۱۰) بیان کرتے ہیں:

> "جب میں آٹھویں نویں جماعت میں تھا تو مجھے آرمی میں جانے کا سوق تھا اس کی وجہ حب الوطنی اور مادرِ وطن کو حفاظت کا شوق تھا جو میرے اندر بیدار ہوا تو میں خوشی سے اس ملازمت میں آیا میں اپنی اس نوکری سے بہت خوش ہوں۔"

کاکول کی دو سالہ ٹریننگ کے بعد اپریل ۱۹۹۵ء میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ٹریننگ کی تکمیل کے بعد پہلی پوسٹنگ کوہاٹ میں ہوئی۔ بعد ازاں ۱۹۹۷ء میں لیفٹیننٹ بن گئے۔ ۱۹۹۹ء میں شہزاد کی ترقی کیپٹن کے عہدے پر ہوئی اور ۲۰۰۷ء میں ترقی پا کر میجر بن گئے۔ ان مختلف عہدوں پر فائز رہتے ہوئے انہوں نے اپنی عسکری اور فوجی روایات کو جواں مردی سے نبھایا۔ فوج اور عسکری پیشہ سے منسلک افراد انتہائی سخت اور حسّاس قوانین کے پابند ہوتے ہیں۔ دورانِ ملازمت شہزاد کی پوسٹنگ مختلف علاقوں میں ہوتی رہی۔ پہلی پوسٹنگ کوہاٹ میں ہونے کے بعد دوسری پوسٹنگ شمالی علاقہ جات کی طرف ہوئی۔ شمالی علاقہ جات میں قیام کے دوران شہزاد کی آگاہی فطرت کے ایک نئے اور سفاک پہلو سے ہوئی۔

نیّر (۱۱) کہتے ہیں:

> "شمالی علاقہ جات میں قیام میرے لیے تجربات سے بھرپور تھا۔ سیاچن پر قیام نے مجھے فطرت کی سفاکی سے آگاہ کیا اور میرے تجربے اور مشاہدے میں آیا کہ فطرت بہت سفاک ہے۔ کائنات اتنی وسیع ہے کہ اس میں انسان کی حیثیت بہت معمولی ہے۔"

شمالی علاقہ جات میں دو سالہ قیام کے بعد اگلی پوسٹنگ کشمیر میں ہوئی۔ کشمیر کے بعد ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۴ء تک لاہور میں مقیم رہے۔ لاہور میں پوسٹنگ کا یہ عرصہ شہزاد کے ذہنی اور ادبی ترقی میں بہت معاون ثابت ہوا اور ان کی قربت احمد ندیم قاسمی، عباس تابش، امجد اسلام امجد اور وزیر آغا سے رہی۔ اس کے علاوہ بڑے اور نامور شعراء اور ادباء سے ادبی نشستیں ہوتی رہیں۔ اس دوران ہی انہوں نے حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے جلسوں میں بھی شرکت کی اور حلقے کے باقاعدہ رکن بن گئے۔ ۲۰۰۴ء میں شہزاد کی پوسٹنگ لاہور سے بلوچستان (کوئٹہ) میں ہو گئی اور ۲۰۰۷ء تک وہ بلوچستان میں رہے۔ ان تین سالوں میں انہوں نے بلوچستان کے اندرونی علاقوں والبندین، خاران، تربت وغیرہ میں بھی فرائض سرانجام دیے۔ کوئٹہ میں ان کے حلقہ احباب میں آغا گل، محسن چنگیزی، دانیال طریر، بیرم غوری وغیرہ شامل تھے۔ کوئٹہ میں قیام کے دوران ہی ان کا پہلا شعری مجموعہ "برفاب" شائع ہوا۔ اس قیام کے دوران ہی انہوں نے بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ بلوچستان کے تین سالہ قیام سے قبل انہوں نے ٹریننگ

کے لیے برطانیہ کا سفر بھی کیا۔اس ٹریننگ کا دورانیہ تین ماہ تھا اور لندن میں قیام کے دوران ہی انہوں نے نظم ویلنٹاین ڈے لکھی۔

ویلنٹاین ڈے

(گل فروش دوشیزہ سے)

زرد پتّے بھی گرائے ہوں گے
کانپتی شام میں لندن کی ہوا نے،لیکن
اس قدر پھول کھلائے ہیں تیرے گالوں پر
تیرا گل فام بدن کوئی گلستاں جیسے
پھول ہاتھوں میں کئی پھول،مگر تیرے نہیں
اجنبی ہاتھ،تیرے ہاتھ سے خوشبو لے کر
اپنے پیاروں کی بہاروں میں چلے جاتے ہیں
چھوڑ کر ایسا خزاں رنگ تری آنکھوں میں
جس کو پھولوں کے خرید دار نہیں دیکھیں گے
تیرے چہرے سے نظر پھول پہ یوں کرتے ہیں
جیسے تُو پھول نہیں !
تیسرے درجے کی دنیا ہو کہ پہلی دنیا
زر کی تلوار وہی
مفلسی ایک طرح وار کیا کرتی ہے
اس طرف سرد ہوا سے تیرے
تمتمائے ہوئے گالوں سے مجھے یاد آئی ہے
اُس طرف دیس کی دوشیزۂ مفلس جس کے
تنوّر کی آتش سے دہک اُٹھتے تھے
جو امیروں کے لئے آگ جلاتی رہتی!
کتنا چاہا ہے کہ میں پھول خریدوں تجھ سے

اور پھر پیار سے تجھ کو ہی تھمادوں، لیکن
آخری پھول کی مہکار ترے ہاتھوں سے
آج کی شام کا بازار مرے ہاتھوں سے
دھوپ کے ساتھ، کہیں اور پھسل جائیں گے
مفلسی ایک طرح وار کیا کرتی ہے!

(۱۲)

اس سفر سے وہ ایک الگ دنیا اور الگ تہذیب سے آشنا ہوئے اور انہوں نے ان تہذیبوں کے تضّاد کا مشاہدہ گہری نظر سے کیا اور نتیجہ میں بہت سی فکر انگیز حقیقتوں سے آشنا ہوئے۔ بلوچستان کے بعد ان کی پوسٹنگ ۲۰۰۹ء میں قبائلی علاقہ جات میں جنگ کے علاقے جنوبی وزیرستان میں ہوئی۔ یہ علاقہ پاکستانی طالبان کا گڑھ تصور کیا جاتا ہے جہاں انتہاپسندی اور سفاکی وبربریت کی کئی کئی کہانیاں روز دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شہزاد نے ایک بہادر فوجی کی طرح یہ وقت گزارا اور ۲۰۰۹ء میں ان کی پوسٹنگ لاہور میں ہو گئی۔ لاہور میں پوسٹنگ کے دوران ہی انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے ابلاغیات کیا اور اس دوران ہی ان کا دوسرا شعری مجموعہ "چاک سے اترے وجود" شائع ہوا۔ ۲۰۱۱ء میں ان کی منتقلی کشمیر ہوئی، کشمیر سے نکل کر پنڈی کا رخ کیا اور ۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۵ء تک پنڈی میں مقیم رہے۔ ۲۰۱۶ء سے ۲۰۱۷ء تک کا عرصہ دوبارہ کوئٹہ میں تعینات رہے۔ ۲۰۱۸ء کا سال جہلم میں گزارا اور وہیں سے ۳۱ دسمبر ۲۰۱۸ کو ریٹائر ہوئے۔ ایک فوجی کو زندگی کے کئی سرد و گرم حالات، سخت موسموں اور حالات کے نشیب و فراز کا سامنا نہایت بہادری سے کرنا پڑتا ہے اور وطن عزیز کی حفاظت کے لیے وہ بھرپور جسمانی اور روحانی قوتوں کا مظاہرہ کرتا ہے، بے بسی، تلخی اور اپنوں کی جدائی جھیلتا ہے۔ شہزاد کو بھی بطور فوجی ان سخت ترین حالات کا سامنا ہوا۔ انہوں نے وطن کی حفاظت اور دفاع کے لیے کارگل کی جنگ لڑی، وزیرستان جیسے جنگی اور سیاچن جیسے برفانی مقام پر بھی اپنے فرائض منصبی کو بھرپور طریقے سے ادا کیا۔ زندگی کے یہی سرد و گرم حالات شہزاد کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کا سبب بنے اور زندگی کے ان سبھی مقامات پر انہوں نے شعر و سخن کے چراغ کو روشن کیے رکھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک فوجی اور شاعر کا سنگم بظاہر بہت مشکل امر دکھائی دیتا ہے ایک تخلیق کار اپنے جذبات و احساسات کی ترسیل کے لیے قلم کا استعمال کرتا ہے تو ایک فوجی اپنے وطن کی حفاظت کے لیے تلوار اُٹھاتا ہے۔

ایک فوجی افسر اور سخن وری کے اس تال میل پر شہزاد (۱۳) کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"شاعر میں پہلے تھا۔ فوجی بعد میں ہوا۔ ساتویں میں تھا کہ نظم غزل کہنے لگا۔ نویں اور دسویں تک دونوٹ بکس شاعری سے بھر گئی تھیں۔ ظاہر ہے یہ کلام مشق کے زمرے میں ہی آتا ہے اور کسی کتاب میں شامل نہیں ہے۔ آرمی میں آنے کا شوق دسویں جماعت میں ہوا۔ آرمی میں آنے کے فوراًبعد بھی میں نے لکھا۔ اپنی نوکری کے دوران بھی شاعری کی پرورش کی۔ جسم و جاں کی کڑی آزمائش میں بھی شعر میرے ساتھ رہے بلکہ میں تو کہوں گا حرف و سخن نے مجھے سہارا دیا، مضبوط بنایا۔ زندگی کو ہر حال میں سخن کی افزائش چاہیے ہوتی ہے، سو یہ کام بھی چلتا رہا۔ میں نے فوجی اور شاعر دونوں کو اپنے اندر جگہ دی۔"

آج کل شہزاد ایک فوجی فاونڈیشن سے وابستہ ہیں اوراس کے علاوہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں دل جمعی سے مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ ماہنامہ "ادبِ لطیف" میں بطور معاون مدیر اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ازدواجی زندگی:

شہزاد کی شادی ان کی خاندانی روایات کے مطابق ۱۹۹۶ء میں ان کی ماموں زاد ریحانہ کوثر سے ہوئی۔ ان کی یہ شادی ان کے والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ ۲۰۰۴ء میں شہزاد نے سیما فردوس سے شادی کی۔ سیما ایف ائی اے میں بطور انویسٹی گیشن آفیسر اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاہور، اسلام آباد اور کوئٹہ ائیرپورٹ پر بطور امیگریشن آفیسر بھی تعینات رہی ہیں۔ سیما خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت اخلاق و کردار کی بھی حامل ہیں اور مطالعہ کا نہایت عمدہ ذوق رکھتی ہیں، شاعری اور مذاح کی دلدادہ ہیں۔ شہزاد کی پہلی بیگم ریحانہ کوثر ۲۰۱۴ء میں کینسر کے مرض کی وجہ سے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔

شہزاد کے ماشاءاللہ پانچ بچے ہیں۔ بڑی بیٹی خوش بخت فضہ ہیں جنہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی، انہیں کوکنگ اور موسیقی کا بہت شوق ہے۔ بیٹے فیضان حیدر بی ایس ماس کمیونیکشن کے طالب علم ہیں، اس کے علاوہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کچھ نہ کچھ طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں اور لکھنے کا شوق رکھتے

ہیں۔ بیٹی سوہا شہزاد ایف ایس سی کی طالبہ ہیں۔ اس کے بعد لعلین فاطمہ ہیں جو کہ نویں جماعت میں پڑھتی ہیں جبکہ سب سے چھوٹے نہال حیدر آٹھویں کے طالب علم ہیں۔ شہزاد نیّر کا گھرانہ ایک مثالی زندگی گزار رہا ہے اور ان کے گھر میں سادگی اور بے تکلفی کا ماحول ہے۔ شہزاد نیّر نے ہر قسم کے حالات میں اپنی فیملی کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ انہیں اپنی فیملی بہت عزیز ہے اور ان کی ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ سخت نوکری اور شعر وادب کی طرف توجہ میں فیملی متاثر نہ ہو۔ شہزاد سخت گیر نہیں بلکہ سمجھدار اور روشن خیال باپ ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کی خواہشات وترجیحات کا احترام کرتے ہوئے انہیں ایک مناسب حد تک آزادی دی ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں بچوں کو ان کے ذہنی رجحانات کے مطابق فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی اور اختیار ہونا چاہیے اور انہوں نے اپنے گھر میں اس کا واضح اعلان کیا ہوا ہے کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ اور اپنے شعبہ کا انتخاب ان کے بچوں کو خود کرنا ہے۔ تعلیم کی کوئی بھی شکل اور قسم بری نہیں ہے۔

اخلاق و کردار:

شہزاد نیّر کی شخصیت نہایت عمدہ اور اعلیٰ خوبیوں کا مرقع ہے۔ وہ ایک شائستہ، انسان دوست، بامروّت، بردبار اور حلیم انسان ہیں اور ان کی طبیعت میں برداشت اور تحمل کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ شہزاد نہایت حسّاس اور سادہ انسان ہیں۔ ان کی شخصیت میں کشش اور جاذبیت کی وجہ سے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔

شہزاد کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سیما(۱۴) کہتی ہیں:

> "شاعر معاشرے سے الگ سوچ کا مالک ہوتا ہے۔ شہزاد بہت سادہ مزاج ہیں اور ان کی طبیعت میں ریاکاری بالکل نہیں ہے جیسے اندر سے ہیں ویسے ہی باہر ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں کھانے میں پسند ناپسند کی بات کی جائے تو انہیں سادہ اور گھر کے کھانے پسند ہیں دیسی کھانے بہت شوق سے کھاتے ہیں اور مٹن اور سبزیاں انہیں بہت مرغوب ہیں۔"

شہزاد کے مشاغل میں مطالعہ، کھیل، باغبانی اور موسیقی شامل ہیں۔ مطالعہ کے بہت زیادہ شوقین ہیں اور تاریخ، فلسفہ، شاعری، سائنسی اور مذہبی تقریباً ہر موضوع پر ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ بین الاقوامی ادب بہت شوق سے

پڑھتے ہیں۔ کھیلوں میں انہیں بیڈ منٹن اور تیراکی بہت پسند ہے۔ پسندیدہ رنگ آف وائٹ ہے، موسموں میں انہیں بہار کا موسم اچھا لگتا ہے۔ ٹی وی پروگرامز میں "حسبِ حال" پروگرام شوق سے دیکھتے ہیں۔ اگر کسی بات پر غصہ آ جائے تو دوسروں پر اُتارنے کی بجائے خود پر ہی جھیل لیتے ہیں اور ٹینشن کے عالم میں پیدل چلتے ہیں یا کوئی دھن گنگنانا شروع کر دیتے ہیں۔

نیّر (۱۵) اپنے مشاغل کے حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "ٹی وی میں خبریں ضرور دیکھتا ہوں، نیشنل جیوگرافک بہت پسند ہے۔ کبھی کبھار فلم بھی دیکھ لیتا ہوں اور چونکہ میری جاب ایسی ہے تو گھومنے پھرنے کے تو بہت مواقع میسر آتے ہیں۔ گلگت بلتستان سے لے کر گوادر اور تربت تک۔۔۔ کراچی سے لے کر پشاور تک، تتاپانی آزاد کشمیر، مظفر آباد سے لے کر کشمیر پنج گور اور تفتان تک، پاکستان کا چپا چپا اور کونا کونا تک دیکھا ہے میں نے اور جہاں بھی گیا ہوں وہاں کی ثقافت زبان پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فیملی کو ساتھ لے کر بھی ٹرپ پر نکلتے رہتے ہیں۔"

شہزاد چونکہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فوجی بھی ہیں اس لیے ان کے مزاج میں دونوں طرح کی خصوصیات اپنی جھلک دکھاتی ہیں فوجی افسر کے مزاج میں جو سختی ہوتی ہے کسی حد تک وہ بھی ہے لیکن ان کے مزاج پر جو کیفیت غالب ہے وہ نرمی اور شائستگی کی ہے۔ سخت اور کرخت لہجے میں بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ موسیقی سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں اور کلاسیکل اور فوک میوزک ان کو بہت پسند ہے۔

ایک انٹرویو میں اپنی پسند ناپسند کا ذکر نیّر (۱۵) کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ اسپورٹس سے بھی لگاؤ رہا اور اسپورٹس تو ہماری فوجی زندگی کا لازمی حصّہ ہوتا ہے۔ والی بال بہت کھیلی، بیڈ منٹن کھیلی اور فٹ بال بھی مگر کم۔ مقابلوں میں بھی حصہ لیا، کرکٹ کم کھیلی اور صرف دل لگی کے لیے۔۔۔ ڈرامے بالکل نہیں دیکھتا، فلمیں کبھی کبھار دیکھتا ہوں اور کوئی کہے کہ یہ آپ کے دیکھنے والی فلم ہے تو ضرور دیکھتا ہوں۔ میوزک کا بہت زیادہ شوقین ہوں۔ میں کبھی بھی کوئی کام کرتے ہوئے موسیقی نہیں سنتا، میں جب موسیقی سن رہا ہوتا ہوں تو آنکھیں بند کر کے مکمل طور پر اپنے آپ کو موسیقی کی لہروں کے حوالے کر دیتا ہوں اور تان اور سُر مجھے جس طرف لے جائیں، میں چلا

جاتا ہوں۔ مجھے نیم کلاسیکل اور کلاسیکل اور غزل بہت پسند ہے اور زیادہ موسیقی وہ اچھی لگتی ہے جو کسی نے کلاسیکل انگ میں خوب گایا ہو، جیسے نصرت فتح علی خاں، طفیل نیازی مرحوم مجھے بہت پسند تھے۔ استاد حامد علی خاں کی گائیکی بہت پسند ہے، اسد امانت علی، ان کے والد امانت علی خان، آج کل حسین بخش گلو کو بہت سنتا ہوں بڑے غلام علی خان کی ٹھمری سنتا ہوں، آج کل کا شور شرابے والا میوزک مجھے پسند نہیں۔

شہزاد کی شعری تصانیف کا تعارف:

شہزاد کی چار شعری تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں جن کا تعارف درج ذیل ہے۔

ا۔ برفاب

شہزاد نے لکھنے کا آغاز تو ساتویں آٹھویں سے ہی کر دیا تھا مگر ان کا پہلا شعری مجموعہ "برفاب" ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا ان کے مطابق تخلیق کار کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنی تخلیق کو پکائے اور پھر اسے دنیا کے سامنے لائے اور کتاب کو انتظار کروانا چاہیے پھر ہی اچھا اظہار ہو سکتا ہے۔ ایک طویل انتظار کے بعد برفاب کی صورت میں ہونے والے اس اظہار نے شعر و ادب کے میدان میں ہلچل مچا دی۔ اب تک اس کتاب کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ برفاب کے معنی کچھ اس طرح ہیں کہ فارسی کے ایک قاعدے کے مطابق جب دو الفاظ ملائے جاتے ہیں تو ان میں سے ایک آدھ حرف کو حذف کیا جاتا ہے اور برفاب مجموعہ ہے برف اور آب کا جیسا کہ سیلاب سیلِ آب کا مجموعہ ہے اور برفاب کا مطلب ہے "برف کا پانی"۔ شعری مجموعہ "برفاب" نظموں پر مشتمل ہے اور اسے ۲۰۰۷ء میں بین الاقوامی ادبی تنظیم پین (PEN) کی طرف سے انٹرنیشنل ایوارڈ PEN LITERARY AWARD سے نوازا گیا۔ اس میں زیادہ تر سیاچن پر لکھی گئی نظمیں شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب کچھ اس طرح ہے۔

ماں جی

آپ کے نام

میرا پہلا کلام آپ نے سنا

اور خوش ہوئی

جب مجھے بولنا بھی نہیں آتا تھا۔

یہ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۳۵ نظمیں اور ایک طویل نظم "خاک" شامل ہے۔ کتاب میں اسلم سراج الدین کا مضمون "برفاب ۔شہزاد نیّر کی نظمیں" ناصر عباس نیّر کا مضمون "برفاب کی نظمیں" طویل نظم خاک پر لکھا گیا شاہد شیدائی کا مضمون "خاک۔۔۔۔ایک مطالعہ" اور دانیال طریر کا مضمون "شہزاد نیّر کا فنی رچاؤ بھی شامل کیے گئے ہیں۔

برفاب پر بات کرتے ہوئے قاضی (۱۶) لکھتے ہیں:

> "شہزاد نیّر اپنی نظموں کے مجموعے "برفاب" کے ساتھ آئے ہیں ۔پہلی خوشی مجھے یہ ہوئی کہ بہت دیر کے بعد شہری غزل کے ہجوم میں نظم کا ورد ہورہا ہے۔ایک نیا ذائقہ، نیا لمس، نیا بانکپن سامنے ہے۔ حسیّاتی سطح پر زندگی کرتے ہوئے، شاعر اپنی نوجوانی کے گرم خون کی سیڑھی چڑھتا استعارہ بھی لایا ہے تو برف، برفاب جیسا۔ اس نوجوان کے ساتھ یہ کیا واردات ہوئی ہے کہاس کے خواب ٹھٹھرنے لگے ہیں کہ اس کی ناک بھی سیاچن کی بلندی پر برف کی قاش بنتی ہے۔ ویسے تو ہم سب ہی دو دنیاؤں میں رہا کرتے ہیں۔ دہری زندگی، دہرا معیار، دہرے چہرے، دہرے برتاؤ، ایک ہم ہوتے ہیں اور ایک ہمارا دشمن جس کے ہم دُوبدو رہتے ہیں۔ شہزاد نیّر تو حقیقت میں بھی دو موسموں، دو مزاجوں سے نبرد آزما ہے۔ اگر وہ محض ایک پروفیشنل ہوتا تو زندگی کے ایک ہی رُخ میں گزر بسر کر لیتا لیکن وہ تو وہاں ہے جہاں شاید اُسے نہیں ہونا چاہیے تھا اور جہاں وہ نہیں ہے وہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لیے یہ ایک طرح کی compulsion ہے لیکن اُسے جینا ہے۔"

شہزاد کے اس مجموعہ کلام کی فضاء اساطیری ہے اور شاعر کا تخیل اور رجحان خارجیت کی طرف ہے۔ شہزاد نے آغاز میں ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہوئے شعر و ادب کی دنیا میں اپنی انفرادیت کا ثبوت پیش کیا۔ شہزاد کی شاعری صرف ایک فوجی کے دل کی حکایت نہیں بلکہ یہ ایک بیانِ حلفی ہے، بنی نوع انسان سے کیا گیا

ایک وعدہ ہے کہ شاعری کی اس دنیا میں سب سچائیاں کھول کر بیان کر دی جائیں گی۔ برفاب کی نظموں کو شہزاد کی طرف سے کیا گیا ایک بیانِ حلفی قرار دیتے ہوئے طاہرہ(۱۷) رقمطراز ہیں:

> "برفاب کی نظموں میں ایک روح دھڑکتی اور دل بولتا ہے جو بندوق برادر ہاتھوں کی کپکپاہٹ اور بھاری بوٹوں کی دھمک میں بھی اک ردھم بھر دیتا ہے۔ برفاب ایک بیانِ حلفی ہے۔ عسکریت کے فلسفہ اور اندازِ زیست کا ایک حکایت نامہ ہے لیکن اس وردی میں ایسا ہی ایک بانکا سجیلا شاعر بھی چھپا ہے جس کا بانکپن انسانی عظمتوں، تمدنی تعمیر، عمرانی فلسفوں اور رومانی محبتوں کو احساس کی نبضوں پر شمار کرتا ہے جو برفاب جیسے خوبصورت شعری مجموعے کا خالق ہے اور جو میجر شہزاد نیّر کہلاتا ہے۔"

برفاب میں شہزاد نے زندگی سے متعلق تجربات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ برف، جنگ، امن، امید، ناامیدی اور موت کے رنگوں کو باہم ملاتے ہوئے اردو نظم گوئی کے باب میں ایک خوبصورت اور متاثر کُن اضافہ کیا ہے۔ برفاب کی نظموں سے ہی ان کے منفرد اسلوبِ شعری اور وسیع و عمیق مشاہدات کا قاری کو علم ہو جاتا ہے۔

چاک سے اُترے وجود:

دوسرا مجموعہ "چاک سے اُترے وجود" ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آیا اور اس کے اب تک تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ کتاب کا انتساب ہے "ان خوابوں بھری آنکھوں کے نام جو محبت میں جینے کی راہ دیکھتی ہیں۔" کتاب میں جو پیش لفظ شامل کیا گیا ہے وہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور نظم کی صورت میں "رستے" کے عنوان سے ہے۔ اس کتاب میں ۵۱ غزلیں اور ۲۷ نظمیں شامل ہیں۔

شہزاد کے اس مجموعہ کلام پر بات کرتے ہوئے سحر (۱۸) لکھتی ہیں:

> "چاک سے اُترے وجود" شہزاد نیّر کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ جس کے مطالعے کے بعد انسان خود کو ایک حیرت بھری فضا میں محسوس کرتا ہے۔ اس فضا میں حقیقت ٹھوس اور مجرد نہیں بلکہ کیفیاتی ہے۔ اس دنیا میں دھند کے سائے اور ہیولے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جسے دیکھا نہیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور جس میں اس نامعلوم دنیا کو

خوبصورت و دلکش شاعرانہ تمثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ آپ نے زندگی کے ان
زاویوں اور رنگوں کو اردو کے شعری کینوس پر اُجاگر کیا ہے جو اجتماعی اور انفرادی سطح پر
اس خطہ کی تہذیب و ثقافت میں موجود تو ہیں لیکن اکثر لکھنے والوں کی گرفت میں نہیں۔
شہزاد نیّر کا فنی و تخلیقی اور فکری و حسیاتی افق بے کراں وسعتوں کا حامل ہے۔"

"چاک سے اُترے وجود" میں ایک اساطیری فضا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص افسانوی رنگ بھی شامل ہے جو کہ شہزاد کے کلام کو پُر تاثیر بناتا ہے۔ اس مجموعہ کی تمام نظموں اور غزلوں میں موضوعات کا ایک منفرد تنّوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ "چاک سے اُترے وجود" میں شہزاد نے نئی اور منفرد علامات اور تراکیب وضع کی ہیں۔ ان کا عربی، فارسی اور اُردو مرکبات سے لبریز اسلوب ان کے کلام کی انفرادیت کی طرف ایک واضح ثبوت ہے۔ ان کے لہجے میں ایک بے ساختگی، خلوص اور ترنم پایا جاتا ہے جو ان کے کلام کو بوجھل نہیں ہونے دیتا۔ "چاک سے اُترے وجود" میں شامل "شکست کس کی"، "درسِ اول"، "لفظ خزانہ"، "دھرتی ماں"، "ہجر کے اندھیرے میں جاگتی نظم"، "اک دریچہ کھلا"، "او لکھی بابل مورے"، "فاصلے نہیں مٹتے"، "جاتے سمے"، "تیرے بعد"، "لہجہ نہ بدلنا"، "گورستان"، "محبت اور دکھ" اور "لفظ میزان پر دھرے جائیں" تنوع اور کرافٹ کے حوالے سے بہت خوبصورت اور عمدہ نظمیں ہیں۔

"چاک سے اُترے وجود" کے عنوان پر بات کرتے ہوئے سائرہ غلام نبی (۱۹) لکھتی ہیں:

"چاک سے اُترے وجود اپنے عنوان سے ہی ایک خاص فکری زاویے کا غماز ہے اور اب
اس مجموعے کے صفحات اُلٹتے ہوئے شاعر کے تخلیقی وجدان اور وفود کے کئی رخ سے
آشنائی ہو رہی ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ وہ آسان لفظوں اور سادہ مصرعوں سے کسی طلسم
خانے میں لے گئے ہیں کہ جہاں معانی کے کھلتے ہوئے اسرار نے بہت سے لمحوں
کے لیے جیسے اسیر کر لیا ہے اور تحیر خیز کیفیت سے رہائی ملی ہے تو پڑھنے والے کی فکر و
سوچ بھی کائناتی نظام کی گردشوں میں چاک کی طرح گھومنے لگی ہے۔"

اس کے علاوہ کتاب میں ڈاکٹر ضیا الحسن کے مضمون "اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کی اُردو غزل" سے اقتباس "شہزاد نیّر کی غزل" اور زاہد حسن کا مضمون "زمانے چلتے رہے" بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کو "پروین شاکر

عکس خوشبو ایوارڈ" برائے سال ۲۰۱۰ء سے بھی نوازا گیا ہے۔اس کتاب میں شہزاد کی ترقی پسند فکر نمایاں نظر آ رہی ہے۔

گِرہ کھلنے تک:

"گِرہ کھلنے تک" تیسرا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۱۳ء میں چھپا۔ یہ مجموعہ نظموں پر مشتمل ہے اور اس میں ۴۷ نظمیں شامل ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ "ساختیات" کے عنوان سے ہے اور یہ بھی نظم کی صورت میں ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲۰۱۳ء میں سامنے آیا اور اس کے اب تک تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ کتاب کا انتساب ہے "زمین کے ان باسیوں کے نام جو آسمان کی خاطر قتل کر دیے گئے۔

عالی(۲۰) لکھتے ہیں:

> "برفاب" اور "چاک سے اُترے وجود" کے بعد "گِرہ کھلنے تک" شہزاد کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنا سارا زور لگا کر جس نئے لب و لہجے اوذرا مختلف طرزِ فکر و احساس کے ساتھ اپنے پہلے مجموعے میں سامنے آتے ہیں بعد کے مجموعوں میں اس سے اگے جانا تو درکنار پہلا معیار بھی برقرار نہیں رکھ پاتے اور قاری جو ان کے طرزِ شعر سے قدرے مانوس ہو چکا ہوتا ہے اسے کوئی نیا کرشمہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ بہت کم شعراء اس مشکل گھاٹی کو عبور کر پاتے ہیں اور اپنے تخلیقی سفر میں تازہ کاری کے ساتھ ساتھ نئے شعری علاقوں کی دریافت جاری رکھنے کا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شہزاد نیّر کا تیسرا مجموعہ بھی یہ خوشگوار تاثر اُبھارتا ہے کہ اس میں فکر و اظہار کی دونوں سطحوں پر بامعنی پیش رفت کی ہے۔"

اس کتاب میں شہزاد نے بطور نظم نگار اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اس مجموعے میں اپنے فن کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ ادبی دنیا میں ہمیں اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک شاعر یا ادیب کی تمام تخلیقات ایک ہی رنگ میں ہوتی ہیں اور ان کا اسلوب اور موضوع عام طور پر ملتا جلتا ہوتا ہے لیکن شہزاد کا انداز سب سے جدا نظر آتا ہے ان کی ہر تحریر گذشتہ سے مختلف اور منفرد ہے اور یہ ہی ایک خوبی ایک تخلیق کار کو اور اس کی تحریر کو زندہ رکھنے کے لیے

کافی ہے۔ شہزاد کا یہ شعری مجموعہ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے ۴۷ نظمیں شامل ہیں ان میں ایک طویل نظم "نوحہ گر" کے عنوان سے بھی ہے، اس کے علاوہ تین پابند نظمیں بھی شامل ہیں۔ کتاب میں شہزاد کی ترقی پسند فکر نمایاں نظر آتی ہے اور شہزاد کی روشن خیالی کھل کر سامنے آتی ہے۔ شہزاد اپنی فکر اور سوچ کے نئے نئے زاویے قاری پر عیاں کرتے ہیں۔ وہ کائنات میں ہونے والی زمانی و مکانی تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہیں ان کی کھوج لگاتے ہیں اور پھر اپنے مخصوص انداز میں انہیں بیان کرتے ہیں۔ ہدایت کار، سقراط، تجسس گِرہ کھولتا ہے، کفن چور، تین اور تین سو، ویلنٹائن ڈے، لوحِ جہاں نما، محو آئینہ داری، ورکنگ وومن اور طویل نظم نوحہ گر بہترین نظمیں ہیں۔

خوابشار:

شہزاد کا چوتھا شعری مجموعی "خوابشار" غزلوں پر مشتمل ہے جو ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۶۹ غزلیں شامل ہیں کتاب کا انتساب والد محترم کے نام ہے۔ "محبتیں، چاہتیں" کے عنوان سے چند آراء بھی کتاب میں شامل کی گئی ہیں اور یہ شہزاد کا پہلا ایسا شعری مجموعہ ہے جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ شہزاد کی غزل کا اسلوب سیدھا، سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔

ساگر (۲۱) لکھتے ہیں:

> "خوابشار" یہ ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے، جس کا مطالعہ کرتے ہوئے دھیان ایک پل بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتا بس دل چاہتا ہے کہ شہزاد کی غزلوں کو پڑھتے ہی چلے جائے اور اگر دھیان اُٹھ بھی جائے تو دل کا موسم اُداس ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ ایک محبت پرور انسان ہے۔ محبت کرنا اور کر کے نبھانا خوب جانتے ہیں۔"

شہزاد کا شمار ان باکمال لوگوں میں ہوتا ہے جو جس صنف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اس کو کمال کی بلندیوں پر پہنچا دیتے ہیں۔ غزل کی صنف سے اپنی محبت اور دلچسپی کا اظہار تو انہوں نے چاک سے اُترے وجود میں ہی کر دیا تھا مگر اس پر اپنی مکمل مہارت اور دسترس کا ثبوت انہوں نے اپنے شعری مجموعے خوابشار میں پیش کیا ہے۔ نظم کی طرح شہزاد نے اپنی غزل میں بھی بہت سے موضوعات کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

شہزاد کی ترجمہ نگاری:

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "کسی زبان سے کسی دوسری زبان میں کلام کی تشریح"۔ انگریزی زبان میں ترجمہ کے لیے Translation کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ درحقیقت ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس کی مدد اور وساطت سے ایک زبان کے فن پارے کو دوسری زبان میں منتقل کر کے اُس زبان کے قارئین کو دوسری زبان کے ادب، تہذیب و تمدن اور ثقافت سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ انسانی علوم کو فروغ دینے میں تراجم ایک مضبوط اور طاقت وار محرک کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ساحر (۲۲) لکھتے ہیں:

> "ترجمہ نگاری: دو تہذیبوں کے مابین علمی مکالمے اور فکری معانقے کا نام ہے۔ یہ دو زبانوں کے تخلیقی اور فکری سطح پر باہمی اظہاریے سے عبارت ہوتا ہے۔ ایک زبان کا رنگ رس اپنی تہذیبی صداقتِ احساس کے ساتھ دوسری زبان جت رنگ و آہنگ سے باہم امیختہ ہو کر، تخلیقِ نو کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔"

ترجمہ ہی کے ذریعے ایک مخصوص ملک اور جغرافیائی خطے کے علوم اور ان کی تحقیقات کی رسائی اور دسترس دوسرے خطوں تک بھی ہوتی ہے اور اسی طرح ان کے علوم و فنون تمام انسانیت کی ملکیت بن جاتے ہیں۔ ترجمہ نگاری کا فن کوئی نیا فن نہیں ہے بلکہ زمانہ قدیم سے ہی رائج و مستعمل ہے اور ہر دور اور زمانے میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ترجمہ جو کہنے میں تو محض پانچ حرفی لفظ ہے لیکن درحقیقت یہ فن جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اردو زبان کو ایک باقاعدہ زبان کے مقام پر فائز کرنے میں تراجم کا سب سے بڑا کردار رہا ہے اور اردو زبان میں ترجمہ نگاری کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود اردو زبان اور ترجمہ کا یہ فن دورِ جدید میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

شہزاد نیّر ایک بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے مترجم بھی ہیں اور وہ اب تک تین کتب کے انگریزی سے اردو زبان میں تراجم کر چکے ہیں۔ تراجم کے لیے شہزاد ایسی کتب کا انتخاب کرتے ہیں جو کہ عوام کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کرنے میں بھی مدد دیں۔ شہزاد نے جو پہلی کتاب ترجمہ کی وہ

معروف مفکر ایڈورڈ ڈی بونو کی "six thinking hats" کا اردو ترجمہ تھا۔ شہزاد کا یہ ترجمہ ۲۰۱۹ء میں منظر عام پر آیا اور اسے بک کارنر جہلم نے چھاپا۔ ایڈورڈ کی یہ کتاب ورلڈ بیسٹ سیلز بکس میں شامل ہے جو دو سو ملین سے بھی زائد فروخت ہو چکی ہے۔ اس کتاب نے کامیاب ترین بزنس لیڈرز کی سوچ کو بدلنے میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ترجمہ شدہ کتاب کا نام "سوچ کے نرالے ڈھنگ" ہے۔ اس کتاب کے ترجمہ کا مقصد سوچنے کے منظم اور سائنسی انداز سے اردو قارئین کو آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ ذہنی کارکردگی میں اضافہ کے لیے نیا انداز اور نئی سوچ کے مطابق کام کر سکیں۔ یہ کتاب وکلا، کاروباری افراد، طلبہ اور ملازمت پیشہ افراد کے ساتھ ساتھ علمی اور فکری تاریخ کے شائقین کے لیے بھی بہت فائدہ مند ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ قاسم علی شاہ نے لکھا ہے اور انہوں نے ہی اس پر نظر ثانی کی ہے۔

کتاب پر بات کرتے ہوئے نیّر (۲۳) لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر ڈی بونو کی سب سے مشہور کتاب Six Thinking Hats کا پہلی بار اُردو ترجمہ پیش ہے۔ یہ کتاب ہمیں مفید اور مربوط انداز میں سوچنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مثبت سوچ بچار سے ہر مسئلے کا حل ممکن ہے۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں سوچنا نہیں آتا۔ جہاں ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ہم جذبات اور غصے سے کام لیتے ہیں جہاں ہمیں اعداد و شمار کی ضرورت ہوتی ہے جہاں ہمیں معلومات اور اعداد و شمار کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ہم اندازے اور قیاس پر چلتے ہیں۔ جہاں تنقیدی فکر درکار ہوتی ہے وہاں ہم چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ہماری سوچ کا عمل ایک الجھاؤ کا شکار رہتا ہے۔"

یہ ترجمہ سلیس زبان میں کیا گیا ہے اور مصنف کے اسلوب کا دھیان رکھتے ہوئے وضاحتی پیرائے میں اصل متن قاری تک پہنچانے کی سعی کی گئی ہے۔ مترجم نے درست معیاری اور دلکش زبان استعمال کی ہے اور یہ کتاب قاری کو سوچنے کے نئے ڈھنگ متعارف کرواتے ہوئے انہیں ایک الگ دنیا میں لے جاتی ہے۔ کتاب عام فہم اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ دل کشی کا تاثر لیے ہوئے ہے اور مترجم نے مکمل کوشش کی ہے کہ ترجمہ درست اور دلکش ہو، شہزاد کی شخصیت و فن پر بات کرتے ہوئے شاہ (۲۴) لکھتے ہیں:

"محترم شہزاد نیّر صاحب علمی و ادبی حلقوں میں ایک معروف شخصیت ہیں۔ اردو زبان وادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور تشنگانِ علم کو مستفیض کرنے کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ یہ کتاب بڑی خصوصیت و اہمیت کی حامل ہے اور پڑھنے والوں کے لیے علمی میدان میں قابلِ استفادہ ہے۔ ان کا غیر معمولی انداز لائقِ تحسین ہے جس میں اُنہوں نے بڑی خوب صورتی سے اس کتاب کے تمام مراحل کو جامع انداز میں بیان کیا ہے تا کہ اہلِ زبان اسے باآسانی سمجھ سکیں۔"

شہزاد کا دوسرا ترجمہ رابرٹ ٹی کیوسکی کی کتاب "why "A" Students Works for "C" "Students کا اردو ترجمہ ہے۔ شہزاد کی ترجمہ شدہ کتاب کا نام "کامیابی کے لیے صرف نمبر نہیں کافی" ہے۔ یہ ترجمہ نئی سوچ پبلشرز نے جون ۲۰۲۰ء میں شائع کیا ہے۔ مترجم نے کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصّہ اوّل کو سات ابواب اور سات اسباق میں تقسیم کیا گیا ہے جبکہ حصّہ دوم آٹھویں باب اور سبق سے شروع ہوتا ہے اور باب نمبر چودہ تک ہے، حصّہ سوم باب نمبر پندرہ اور سولہ پر مشتمل ہے اور حصّہ چہارم جو کہ آخری حصّہ ہے باب نمبر سترہ اور اٹھارہ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کاروباری ترقی، کاروبار کی اہمیت، کاروباری اسرار و رموز سے آگاہ کرتی ایک دلچسپ معلوماتی کتاب ہے۔ رابرٹ ٹی کیوسکی کی کتاب ان کی مقبول ترین کتابوں میں شامل ہے اور یہ ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔ کیوسکی بچوں کی مالیاتی اور کاروباری تعلیم و تربیت کے لیے عملی جدوجہد کرتے ہیں اور ان کی یہ کے کتاب ذہن سازی کے عمل کو آسان بنا دیتی ہے۔ نیّر (۲۵) لکھتے ہیں:

"میں اس کتاب کا ترجمہ کرکے اس لیے بھی مسرور ہوں کہ مجھے لگتا ہے ہمارے وطن میں کاروباری سرگرمیوں کے ذریعے معاشرتی ترقی کی بہت ضرورت ہے اور یہ کتاب کاروبار کی اہمیت، مالی اُمور میں خاص نوع کی ذہانت، کاروباری اسرار و رموز اور بچوں کی مالیاتی تربیت پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ اس کتاب کے قارئین اپنی ذہنی روش میں تبدیلی محسوس کریں گے۔ محض نوکری پر بھروسہ کرنے کے بجائے، وہ تجارت، کاروبار، سرمایہ کاری اور پیداواری منصوبوں میں توانائیاں صرف کر کے پیسہ کمائیں گے۔ اس سے ملکی معیشت ترقی اور تحرک کی طرف جائے گی، عوام کو روزگار ملے گا اور غربت میں کمی آئے گی۔"

یہ کتاب قارئین کی ذہنی روش کو بدلنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے کہ محض نوکری ہی امیر ہونے یا پیسہ کمانے کا راستہ نہیں بلکہ تجارت اور کاروبار سے ملکی معیشت زیادہ تیزی سے ترقی کر سکتی ہے اور عوام کو بہتر طریقے سے روزگار مل سکتا ہے۔اس کے علاوہ والدین کی بھی رہنمائی کی گئی ہے کہ کس طرح بچوں کی مالیاتی ذہانت کو اُبھارا جا سکتا ہے۔موجودہ نظام تعلیم کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ طالب علموں کو نوکری پیشہ بنانے کی تربیت دیتا ہے اوران کو ایک مخصوص طرز کی غلامانہ سوچ کا عادی بنا رہا ہے جبکہ کیوسکی کی نظر میں انہیں نوکری دینے والا بنانے کی ضرورت ہے۔شہزاد کی ترجمہ کی گئی یہ دونوں کتب نہایت اہم ہیں اور ترجمہ نگاری کے فن میں ایک خوبصورت اور انوکھی طرز کا اضافہ ثابت ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ شہزاد کا کیا گیا ایک اور ترجمہ "یوگا اور ذیا بیطس" YOGA and DIABATESزیرِ طباعت ہے۔یہ ترجمہ عوام کو طبی مسائل اوران کے بہترین حل سے آگاہ کرتا ہوا نہایت مفید اور اہم تجربہ ہے۔

شہزاد کی تنقید نگاری:

تنقید کے لغوی معنی "پرکھنے "اور "اچھے برے میں فرق کرنا" کے ہیں۔ادب میں یہ اصطلاح کسی بھی فن پارے کے معائب و محاسن معلوم کرنا کے معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔انگریزی میں تنقید کے لیے criticismکالفظ استعمال ہوتا ہے۔ایک نقّاد فن پارے کو سمجھتا اوراس پر مکمل غور کرتا ہے'کسی بھی فن پارے کے مکمل مطالعے کے بعد وہ اس فن پارے کی اچھائیاں، برائیاں اور تمام پہلو کھول کر بیان کرتا ہے اوراس فن پارے کی قدروقیمت کا صحیح تعین کرتا ہے۔تنقید ادب کی تمام اصناف یعنی شاعری،افسانہ نگاری،ناول نگاری، آپ بیتی،ڈرامہ نگاری اور دیگر تمام اصناف پر کی جاتی ہے۔تنقید کی تعریف بیان کرتے ہوئے سیّد(۲۶)لکھتے ہیں:

> "تنقید کے معنی ہیں، کھرا کھوٹا پرکھنا۔اصطلاحاً کسی موجود مواد کی خوبی یا برائی، حسن و قبح اور جمال اور بدصورتی کے متعلق چھان بین اور اس پر فیصلہ دینا، نقاد کے مدِ نظر ہوتا ہے۔"

شہزاد بطور نثر نگار اور تنقید نگار بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں اور انہوں نے نظم کے ساتھ ساتھ نثر کے میدان میں بھی اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔نثر میں انہوں نے ترجمہ نگاری کے ساتھ ساتھ رپورتاژ،

افسانچے، مائکروف اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ "سمبل"، "ادبِ لطیف"، "صحیفہ" اور "بیاض" جیسے مایہ ناز ادبی رسائل میں ان کے لکھے تنقیدی مضامین تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شہزاد کے لکھے ہوئے تنقیدی مضامین کی تعداد تقریباً سو سے زائد ہے اورانہوں نے اردو ادب کی نامور شخصیات کے ساتھ ساتھ معاصر شعراء اور ادباء کے متعلق بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور کئی شعراء کے شعری مجموعوں کے دیباچے اور فلیپ لکھے ہیں۔ انہوں نے ادب کی مایہ ناز ہستیوں میں ساحر لدھیانوی، ثروت حسین، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کو اپنے تنقیدی مضامین سے بہترین خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شخصیت سے شہزاد کو والہانہ لگاؤ اور عقیدت رہی ہے۔ قاسمی کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں نیّر (۲۷) لکھتے ہیں:

> "عبدالمجید سالک نے ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کو کراچی میں بیٹھ کر یہ تعارف لکا تو انہیں ندیم کے مستقبل کی خوب خبر تھی۔ وہ بصد اصرار دہراتے ہیں "ایشیا کے افق پر ایک عظیم شاعر نمودار ہوا ہے"۔ میں سر انگشت کو نمناک کرتا ہوں۔ ورق آگے کو اُلٹا ہے تو مہ وسال پیچھے کو اُلٹ جاتے ہیں۔ ۲۱ جولائی ۱۹۵۲ء ممتاز حسین دیباچہ لکھتے نظر آتے ہیں۔ وہ تاریخ کے نشیب و فراز، انسانوں کی اونچ نیچ اور عقیدہ و استحصال کی گھاٹیوں سے ہوتے ہوئے کس سہولت سے یہاں تک پہنچتے ہیں۔" قاسمی نے چھتیس سال کی عمر میں شاعرانہ فکر کی جن بلندیوں کو چھوا ہے وہاں تک رسائی اس عمر کے بہت کم شعراء کو ہوئی۔ "میں نزاکت سے صفحہ پلٹتا ہوں تو پابند نظمیں مجھے دیکھ کر آنکھیں جھپکتی ہیں، اُداس مسکراہٹ نچھاور کرتی ہیں جو خم اور خوشی کے مشترک احساس سے جاگتی ہے۔ دل کاتب کے قط کا اسیر ہوتا ہے تو میں نظموں میں رواں ہو جاتا ہوں۔ جابجا رنگین پنسلوں کے نشان فردوسِ نگاہ ہوتے ہیں۔ مجھ سے پہلا، مجھ سے زیادہ باذوق ثابت ہونے لگتا ہے۔"

تنقید میں شہزاد کا لہجہ روکھا اور کرخت نہیں بلکہ دھیما اور سبک رو ہے اور وہ ادب کی مختلف جہات پر اپنا اندازِ فکر مدلل انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے الفاظ کا چناؤ اور بات کرنے کا انداز اس بات کی واضح گواہی پیش کرتے ہیں کہ شہزاد علم و فن پر دسترس اور مہارت رکھتے ہیں۔ ایک اچھا تنقید نگار ادب کی تمام اصناف پر عبور رکھتا ہے اوراس قابل ہوتا ہے کہ ادب کی تمام اصناف پر اپنا اظہار احسن انداز سے کر سکے اور شہزاد

میں اچھے نقاد کا یہ وصف باخوبی موجود ہے۔ انہوں نے شعراء کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاروں پر بھی تنقیدی مضامین لکھ کے اس بات کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ہم عصر شعراء میں انہوں نے وصی شاہ، انجم یوسف زئی، ف۔ س۔ اعجاز، ایوب خاور، شاکر کنڈان، نذر عابد، بیرم غورری اور شاعرات میں نیلم احمد بشیر کے فکر و فن پر اپنے تنقیدی مضامین میں روشنی ڈالی ہے اوران کی ادبی قدر و منزلت کو واضح کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں کہیں لطیف پیرائے میں طنز و مزاح سے کام لیتے ہوئے اپنا مطمع نظر بیان کیا ہے تو کہیں ان کا لہجہ سائنسی مکتبۂ فکر اختیار کر گیا ہے، کہیں وہ ایک ماہر لسانیات کے طور پر نظر آتے ہیں تو کہیں ان کا لہجہ منطقی رنگ لیے ہوئے ہے اور وہ ایک تاریخ دان کی طرح تاریخی حقائق کھولتے نظر آتے ہیں۔ شہزاد زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتے ہیں اور زبانوں کے حوالے سے ہونے والے نت نئے تجربات پر بھی اپنا اظہارِ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔ زبان کے حوالے سے صحیفہ میں شامل اپنے ایک مضمون میں نیّر (۲۸) لکھتے ہیں:

> مختلف علاقائی زبانیں بولنے والوں کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو باہمی رابطے اور بول چال کے لیے استعمال ہو سکے۔ اردو نے اس ضرورت کو بطریق احسن پورا کیا اور یوں اُردو کئی منازل طے کرتی جا رہی ہے۔ مختلف علاقائی زبانیں بولنے والے تو آپس میں اردو کے ذریعے تبادلہ خیال کرتے ہی ہیں، بڑے شہروں مثلاً گلگت سکردو، ہنزہ، چترال، چلاس، چیلو، استوار اور گاکوچ کی گلیوں بازاروں میں اردو زبان بلا تکلف اور باسہولت بولی جاتی ہے۔ شمالی علاقہ جات کا نظامِ تعلیم وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام ہے۔ سکول کی سطح پر اردو زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے جب کہ کالج کی سطح پر پاکستان کے دیگر علاقوں کی طرح اُردو انٹر تک بحیثیت لازمی مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ اس طرح خواندہ لوگوں کا ذریعہ اظہار اُردو ہونا سمجھ میں آتا ہے، لیکن ناخواندہ لوگوں کو اُردو میں بات چیت کے قابل ہونا ایک ایسا مظہر ہے جسے سوائے اُردو کی محبت کے، کوئی نام دینا مشکل ہے۔ ان علاقوں کے ناخواندہ یا کم خواندہ لوگوں کی اردو بول چال میں تذکیر و تانیث اور جملے کی انشائی تشکیل کی غلطیاں مل جاتی ہیں۔ اس کی وجہ مقامی زبانوں اوراردو کے الفاظ کی تذکیر و تانیث میں تفاوت ہے۔ یہ مظہر صوبہ سرحد کے عوام کی تذکیر و تانیث کی اغلاط سے مشابہہ ہے۔ اس کی علمی وجوہ کی تلاش اور غلطیوں سے بچنے کے طریقے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔"

شہزاد اپنے مضامین اور دیباچوں میں ایک بہترین نقاد اور محقق کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور انہوں نے اپنے مضامین میں بے دھڑک ہو کر لکھا ہے اور ایسا صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اس صنف کے تمام اسرار و رموز سے واقفیت رکھتا ہو۔ شہزاد کے تنقیدی مضامین پڑھ کر اس بات کا باخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور زبان و بیان پر وہ خوب دسترس اور مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے تنقیدی و سائنسی اور تحقیقی مضامین لکھ کر بھی اپنا آپ منوایا ہے کہ وہ جلد نثر کے میدان کے بھی فاتح قرار پانے والے ہیں۔ تنقید کی سب سے اہم شرط ناقد کی غیر جانبداری ہے اور شہزاد اپنی تنقید میں ہمیشہ غیر جانبدار اور پُر سکون دکھائی دیتے ہیں وہ تنقید برائے تنقید کی بجائے دھیمے لہجے میں اغلاط کی نشاندہی کرتے ہیں اور تصوف سے لے کر سائنس اور تاریخ سے لے کر فلسفہ اور ماحول غرض تمام موضوعات پر بلا جھجک لکھتے ہیں۔

شہزاد کی پنجابی شاعری:

شہزاد کی شخصیت ہر فن مولا ہے اور انہیں علم و زبان پر اس قدر مہارت اور عبور حاصل ہے کہ وہ جس صنف اور زبان میں طبع آزمائی کرتے ہیں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیتے ہیں۔ شہزاد اردو شاعری کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی شاعری کرتے رہتے ہیں اور ان کے کئی پنجابی نظموں کو فلمایا بھی جا چکا ہے۔ پنجابی شاعری میں بھی شہزاد کا اسلوب اور انداز بہت منفرد اور دلکش ہے اور ان کی پنجابی نظمیں بھی اپنا گہرا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ ان کی ایک معروف پنجابی نظم ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

کونجاں دی کُرلاٹ (پنجاب دیاں دھیاں داہاڑا)

ناں ہتھ ودھائیں ظالماں، ناں ٹاہنی اُتوں لا
اسیں کلیاں درداں ماریاں، سانوں وصلاں دا اے چا
توپل دوپل وچ توڑ کے، ٹر جانایں جھولی پر
اسیں رُلیاں وچ تھلاں دے آتے چھڈے شہر بھبھور
ساتھوں راہ گواچی کیچ دی، ساڈی اوکھی ہو گئی ٹور
اسی ڈولی چیکاں ماریاں، ساڈی ہتھ بگانے ڈور

اسیں رانجھن سُفنے ویندیاں، سانوں کھڑ دے کوئی ہور

اسیں بھیڑے پل دیاں جمیاں، ساڈے لیکھ نے ساڈے چور

ساڈا پار کھلو تا ہان دا، وچ دریا زور وزور

اساں گھڑیاں مِنتاں کیتیاں، جد لہر اں پایا شور

اسیں وچ چناں سے ڈُبیاں، ساڈی دیس بگانے گور

ساڈے وال تھلاں وچ کھُل گئے اتے لیڑے لیر ولیر

سانوں کھیڑیاں کھُر لی بنَیا، ساڈے رانجھے پھِرن فقیر

جد ماپیاں واجاں ماریاں، اساں آپے توڑے تیر

ساڈے مرزے لہو وِچ نہا گئے، ساڈے ویری ہو گئے ویر

ساڈے ہنجو وا چھڑ ساون دی، ساڈی کدے نا سُکی اکھ

جد قسمت مکھ پر تالوے فر کیہڑا کر دا ای پکھ

اساں پُٹھے توے دی کھا لئی، اتے بالے ہجر دے ککھ

کیہ جسماں سے وچ لبھنایں، اسیں اپ توں ہویاں وکھ

سانوں عشق نیں متّاں دِتیاں اتے چاہڑے سوہے رنگ

سانوں سُولاں سُولی چاہڑیا، ساڈے چھیکو چھیک نیں انگ

ساڈی تھاں تھاں کِھلری واشنا، اتے لبھے اپنا سنگ

ساڈے بَھور گوا چے جنگلاں جیوں در در ہون ملنگ

ساڈے پیراں مٹی بنّیا، ساڈا چلد انئیں کوئی وا

سانوں ساڈے ہنجواں پیچیا، اساں کھاہدی درد ہوا

سانوں اگ غماں دی ساڑ دی اتے سد ھراں ہون سوا

اسیں کلیاں درداں ماریاں، ناں ٹاہنی اتوں لا

غرض کہ شہزاد کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات اور تصانیف کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہزاد ایک عہد ساز شخصیت کے حامل ہے۔ ان کی شخصیت غیر معمولی ہے اوران کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔شہزاد کی شعری تصانیف کو بہت سے اعزازات سے نوازا جاچکا ہے اور مختلف ادبی حلقوں میں ان کا نام بہت عزت واحترام سے لیاجاتاہے۔شہزاد نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر بھی لکھی ہے اوران کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی نثر میں بھی ان کے اسلوب کا جادو سر چڑھ کر بولتاہے۔ آنے والے ابواب میں شہزاد کی نظم و غزل کا جائزہ لیا جائے گااور مختلف ناقدین کی آراکی روشنی میں ان کاادبی شعری مقام ومرتبہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

حوالہ جات

۱۔ نیّر، شہزاد (مصاحبہ) سوالات از حفصہ طاہرہ، لاہور، ۴ ستمبر ۲۰۲۰ء

۲۔ احد، عائشہ (مصاحبہ) سوالات از حفصہ طاہرہ، لاہور، ۴ ستمبر ۲۰۲۰

۳۔ نیّر، شہزاد (۲۰۰۶ء) "برفاب" ، لاہور، سانجھ پبلشرز، ص ۵۱، ۵۰

۴۔ نیّر، شہزاد، انٹرویو "روزنامہ حرمت" سوالات از ڈاکٹر چوہدری تنویر سردار، لاہور، جمعرات، ۱۱ اپریل ۲۰۱۹، ص ۳

۵۔ نیّر، شہزاد (انٹرویو) "آپ کے روبرو" مشمولہ "ماہنامہ ریشم" شمارہ ۱۱، جلد نمبر ۱۶، جولائی ۲۰۱۶، ص ۲۷۱

۶۔ نیّر، شہزاد (مصاحبہ) سوالات از حافظ امین نفیس، مشمولہ "روزنامہ پوسٹ مارٹم" چیف ایڈیٹر "ذبیح اللہ بلکن" گوجرانوالہ، ۲۲ اپریل ۲۰۲۰، ص ۸

۷۔ نیّر، شہزاد (انٹرویو) سوالات از صفیہ کوثر مشمولہ وقار النساء کالج میگزین (۲۰۱۷-۲۰۱۸) روالپنڈی، پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، ص ۲۸

۸۔ نیّر، شہزاد (انٹرویو) "شہزاد نیّر سے ایک ملاقات" سوالات از آصف اے شیخ، ابو سلیمان، مشمولہ "پارہ چنّار" شمارہ نمبر ۸ (اگست ۲۰۱۱) لاہور، میاں مارکیٹ آؤٹ فال، ص ۲۸

۹۔ نیّر، شہزاد (انٹرویو) "منفرد لب ولہجے کے شاعر۔۔۔ محقق، نقاد شہزاد نیّر سے خصوصی گفتگو" سوالات از شاہدہ مجید، مشمولہ "انصاف" سنڈے میگزین ۲۸ جنوری ۲۰۱۸، ص ۴

۱۰۔ نیّر، شہزاد (مصاحبہ) "میجر شہزاد نیّر سے خصوصی ملاقات" مشمولہ "روزنامہ حرمت" لاہور، ۱۱ اپریل ۲۰۱۹، ص ۳

۱۱۔ نیّر، شہزاد (مصاحبہ) سوالات از راجہ مدثر مشمولہ "روزنامہ ایکسپریس" اسلام آباد، ۱۴ جنوری ۲۰۱۶ ص ۱۶

۱۲۔ نیّر، شہزاد (۲۰۱۳ء) "گرہ کھلنے تک" جہلم، بک کارنر، ص ۴۱-۴۲

۱۳۔ نیّر، شہزاد انٹرویو مشمولہ "قلم کی روشنی" شمارہ (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۸) مولف اعلیٰ "محمود ظفر اقبال ہاشمی، ص ۲۱۷

۱۴۔ سیما، شہزاد (مصاحبہ) سوالات از حفصہ طاہرہ

۱۵۔ نیّر، شہزاد انٹرویو سوالات از شاہین رشید مشمولہ "ماہنامہ کرن" (مارچ ۲۰۱۸ء) جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۱۲، کراچی، ابن حسن پرنٹنگ پریس، مدیرہ نادرہ خاتون، ص ۳۳، ۳۲

۱۶۔ قاضی، محمود احمد (نومبر ۲۰۰۷ء) "شہزاد نیّر اور برفاب" مشمولہ "ماہنامہ الحمراء" مدیر شاہد علی خاں، لاہور، ص ۹۳

۱۷۔ اقبال، طاہرہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۹ء) "بیانِ حلفی" مشمولہ "زر نگار" مدیر علامہ ضیاء حسین ضیا، فیصل آباد، کراچی، پیراگون بک فاؤنڈیشن، ص ۲۰۴

۱۸۔ سحر، عکاشہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء و جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء) "چاک سے اُترے وجود، شہزاد نیّر کا مجموعہ کلام" مشمولہ "ادبِ معلیٰ" مدیر ڈاکٹر ناصر رانا، لاہور، حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، ص ۱۷۷

۱۹۔ غلام نبی، سائرہ (اکتوبر ۲۰۰۹ء) "باتیں کتابوں کی" مشمولہ "ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ" مدیر نادرہ خاتون، کراچی، ص ۲۸۵

۲۰۔ عالی، جلیل (جولائی ۲۰۱۵) "گرہ کھلنے تک کی فکری و شعری دھن" مشمولہ "ادبِ لطیف" مدیر ناصر زیدی، ص ۸۷

۲۱۔ ساگر، صدام (۱۵ اکتوبر ۲۰۲۰ء) "فکر و خیال کا جاں سوز شاعر۔۔۔ شہزاد نیّر" مشمولہ "ہفت روزہ مارگلہ نیوز" مدیر توقیر کھرل، اسلام آباد، ص ۱۳

۲۲۔ ساحر، عبدالعزیز (۲۰۰۷ء) "ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن" اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۱۰۱

۲۳۔ نیّر، شہزاد (اگست ۲۰۱۹) "غرض مترجم" مشمولہ "سوچ کے نرالے ڈھنگ" جہلم، بک کارنر، ص ۱۶

۲۴۔ شاہ، قاسم علی (اگست ۲۰۱۹ء) "حرفے چند" مشمولہ "سوچ کے نرالے ڈھنگ" جہلم، بک کارنر، ص ۱۱

۲۵۔ نیّر، شہزاد (جون ۲۰۲۰) "عرضِ مترجم" مشمولہ "کامیابی کے لیے نمبر نہیں کافی" لاہور، نئی سوچ پبلشرز، ص ۲۲

۲۶۔ سیّد، عبداللہ (فروری ۱۹۶۵ء) "مباحث" لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ص ۳۶۵

۲۷۔ نیّر، شہزاد (جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء) "شعلۂ گل" مشمولہ سہ ماہی "مونتاج"، لاہور، مدیرہ منصورہ احمد، ص ۲۹۸

۲۸۔ نیّر، شہزاد (اپریل تا جون ۲۰۰۲ء) "اردو اور شمالی علاقہ جات" مشمولہ "صحیفہ" لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب" ص ۱۲۷

باب سوم

شہزاد کی نظم نگاری

اردو نظم۔۔۔تاریخ وارتقاء

شہزاد کی نظم کا فکری وفنی جائزہ

(نعت،منقبت، طویل نظمیں، آزاد نظم)

باب سوم

شہزاد کی نظم نگاری

اردو میں نظم نگاری۔۔۔ تاریخ وارتقاء

شاعری کی اصناف میں نظم ایک اہم صنفِ سخن کے طور پر جانی جاتی ہے۔ نظم شاعری کی وہ شکل ہے جس میں کوئی واقع یا خیال تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ نظم کے معنی یکجا کرنے اور پرونے کے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ (۱) میں نظم کے معانی یوں درج ہیں۔

"اپرونا، موتیوں کو تاگے میں پرونا، لڑی، سلک، ۲انتظام، بندوبست، ۳کلام موزوں، شعر، پد، چھند، گیت، ضد نثر"

نظم کے لیے ضروری ہے کہ خیال یا معانی کے اعتبار سے اس میں ایک تسلسل ہو اور ایک شعر دوسرے سے پیوست ہوتا چلا جائے۔ نظم کے موضوعات میں بہت تنّوع پایا جاتا ہے اس کے موضوعات لامحدود ہیں اوران کی مختلف شکلیں ہیں۔

جمال(۲) نظم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کس قدر خوبی اور جامعیت سے کرتے ہیں:

"نظم انسان کی ذہنی اور فطری صلاحیت کی وہ معجز منائی ہے جس کے عملی عناصر کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ ہم آسانی سے اسے تخلیق اور تخلیقی عمل کی کارفرمائی کا نام دے سکتے ہیں، جس میں زبان اور ہیئت "آلات" کے طور پر استعمال ہوسکتے ہیں۔"

نظم کی تعریف کرتے ہوئے آغا(۳) لکھتے ہیں:

"نظم بنیادی طور پر تاثرات کے تجزیاتی مطالعے کا ایک وسیلہ ہے اور اس خاص میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں۔"

یعنی نظم وہ صنف سخن ہے جس میں ایک ہی مضمون یا خیال بیان کیا گیا ہو اور یہ باوزن ہو۔ ہیت کے اعتبار سے نظم کی مختلف شکلیں ہیں۔ مسمط کی شکلیں یعنی مثلث، مربع، مخمس، مسدّس، مسبّع، مثمن، مستع، معشر سب اس میں شامل ہیں۔ اس طرح ترکیب بند اور ترجیع بند بھی ہیں۔ پابند نظم جو کہ نظم کی ایک روایتی صورت ہے اس کے علاوہ نثری نظم، نظم معریٰ اور آزاد نظم مغربی اثر سے اردو میں رواج پا چکی ہیں اور اب خصوصی مقبولیت اختیار کر چکی ہیں۔ مثنوی، قصیدہ اور گیت بھی نظم کی ہی شکل ہیں اور حمد، نعت، قصیدہ، مثنوی، واسوخت اور شہر آشوب سب نظم کے دائرہ میں ہی آتی ہیں۔

نظم کے آغاز کے متعلق بریلوی (۴) لکھتے ہیں:

> "اُردو میں غزل کے ساتھ ساتھ نظم کی تخلیق کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ اُردو میں یہ جو مختلف موضوعات پر بے شمار مثنویاں لکھی گئی ہیں، یہ جو مخمسّ، مسدّس، مثلث، ترجیع بند اور ترکیب بند وغیرہ میں جو مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے، کیا ان کو نظم کی مختلف اصناف نہیں کہا جا سکتا۔ میرے خیال میں ملا وجہی کی قطب مشتری، محمد قلی قطب شاہ کی چھوٹی چھوٹی مثنویاں، سودا کی ہجویات، میر تقی میر، میر حسن اور مصحفی اور جرات وغیرہ کی مثنویاں اور دوسری اصناف، درحقیقت نظمیں ہیں جو غزل کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے زمانوں کے تقاضوں کو پورا کرتی رہی ہیں۔ نشیب و فراز اس میں آتے رہے ہیں۔"

نظم نگاری کی ابتدا کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے ہاتھوں نظم کی ابتدا اور آغاز ہوا اور صوفیائے کرام کی نظموں کا موضوع دین اسلام اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی تعریف و محبت کا اظہار تھا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کئی نظموں کا حوالہ ملتا ہے اور شاہ میراں جی کی مثنوی کے سے انداز میں لکھی گئی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں ایک تمثیلی نظم "جنگ نامہ پشواز وساری وچولی وتہبند وازار" بھی موجود ہے جو کہ مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ حضرت شاہ جانم جو کہ شاہ میراں جی کے فرزند، مرید اور خلیفہ تھے ان کے ہاں بھی دیگر بزرگان دین کی طرز میں راگ راگنیوں کے تحت لکھی گئی نظمیں ملتی ہیں۔ بھگت کبیر کے بارہ ماسے بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ بارہ ماسہ دراصل ایک فراق نامہ یا سرگزشت ہجراں ہے جو عورت

کی طرف سے بیان ہوتا ہے یہ ہمیشہ نظم کی صورت میں ہوتا ہے اور ہر بند میں ایک ایک ماہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اردو نظم کو جب شاہی سرپرستی حاصل ہوئی تو مذاہب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی نظمیں کہی جانے لگی۔ اس ضمن میں مصطفیٰ گجراتی مہدوی کی ایک نظم ملتی ہے جس میں انہوں نے مغلوں کی قید کے زمانے میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں عاشقانہ نظمیں بھی ہیں اور ہندو مسلم تقریبات، رسومات اور کھیل کود پر بھی نظمیں شامل ہیں۔ غواصی کی نظموں کی ہیئت قصیدہ کی سی ہے اوراس میں اختصار پسندی نمایاں ہے۔ اس دور کی نظموں پر ہندی اور فارسی کے نمایاں اثرات تھے اور یہ زیادہ تر قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کی شکل میں لکھی جاتی تھیں۔ آغاز سے ہی غزل کے علاوہ تمام ہیئتی اور موضوعی اصناف نظم کے نام سے موسوم رہی ہیں لہذا غزل کے سوا تمام اصنافِ شعری اپنی علیحدہ علیحدہ صورتوں میں نظمیں ہی ہیں اور مختلف وضع کی نظمیں مختلف زمانوں میں ماحول کے داخلی وخارجی اثرات کے پیش نظر اپنی صورتیں تبدیل کرتی رہی ہیں۔

آغا(۵) لکھتے ہیں:

> "دکنی نظم عام طور پر مثنوی، قصیدہ اور مرثیے کے روپ میں ابھری۔ بیشک ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے یہ اصناف ایک دوسرے سے مختلف ہیں تاہم خارجی اشیاء اور واقعات کو مس کرنے، نیز استقرائی عمل کو اختیار کرنے کے باعث یہ اصناف نظم کے زمرے ہی میں شامل ہو جاتی ہیں۔"

اردو غزل کے ایک اہم اوراولین شاعر ولی کے کلام میں بھی ۴۷ اشعار کی نظم "سورت" ملتی ہے جس کا انداز قصیدہ کا سا اور ہیئت مثنوی کی ہے۔ جعفر زٹلی ایک ایسا شاعر جس نے اپنے زمانے کے مروجہ اور عام پسندیدہ موضوعات سے ہٹ کر شاعری کی اس کی کئی نظموں میں اس دور کی سیاسی و معاشرتی حالت کا بیان ملتا ہے اوراس کی نظموں میں موضوعات کے ساتھ ساتھ ہیئت کے استعمال میں بھی تبدیلی ہوئی۔ جعفر زٹلی کے ہاں غیر مقفیٰ نظم کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ فائز کے دیوان میں بھی کئی نظمیں موجود ہیں جو کہ قلی قطب شاہ کی روش میں عورتوں کے نازوانداز اور ان کی تعریف میں لکھی گئی ہیں۔ "تعریف پنگھٹ" ۱۷ اشعار کی ایک بیانیہ نظم ہے جس میں پنگھٹ پر جانے اور وہاں مہ وشوں کی محفل دیکھنے کا ذکر بیان کیا گیا ہے۔ "ہولی" ۱۴ اشعار کی ایک نہایت دل چسپ نظم میں ہندوؤں کے تہوار ہولی کا حال بتایا گیا ہے۔ فائز کے ساتھ ساتھ آبرو کی نظموں کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے ان

میں "موعظہ آرائش معشوق" ایک مشہور نظم ہے۔ شیخ ظہور الدین جو کہ شاہ حاتم کے نام سے مشہور ہوئے ان کے کلیات میں بھی "ساقی نامہ" کے علاوہ دو اور اہم نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں ایک "قہوہ" اور دوسری "تمباکو وحُقّہ" ہے۔

سودا نے کئی دوسری اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ان کی چند اہم نظموں میں "شدتِ گرما" نرپت سنگھ کا ہاتھی" ہجو اسپ" اور " لامعلوم الاسم اخلاقی نظم" قابل ذکر ہیں۔ "شدتِ گرما" میں فطری مناظر اور موسمِ گرما کا بیان کیا گیا ہے۔ "نرپت سنگھ کا ہاتھی ایک ہجویہ نظم ہے۔ "ہجوِ اسپ" بھی ہجویہ نظم ہے۔ "لا معلوم الاسم اخلاقی نظم" ایک ناصحانہ نظم ہے جو کہ مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ میر تقی میر نے بھی نظم کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ میر کی نظموں میں "اژدرنامہ"، "خانہ خود"، "شدتِ یاراں"، "سگ و گریہ"، "بُنز"، "موہنی بلی"، "جھوٹ"، "ہجو اکول" نمایاں ہیں۔ قائم چاند پوری کی نظموں میں "سردی"، "بھنگی"، "ہجو اکول"، "کیچڑ بسولی"، "بندوق"، "ہولی" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ قائم کے کلیات میں "حکایات" کے عنوان سے چند مختصر مگر جامع اخلاقی نظمیں بھی موجود ہیں۔ مصحفی کی نظموں کے موضوعات معاصر شعراء کے ہاں بھی ملتے ہیں اور ان کی نظمیں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ میر حسن، انشا اور رنگین کی نظموں میں بھی ان ہی عام موضوعات کا بیان ہے اور کوئی جدت یا نیاپن موجود نہیں۔

آغاز سے ہی ہیئتی اور موضوعی اصناف نظم کے نام سے موسوم رہی ہیں لہذا غزل کے سوا تمام اصنافِ شعری اپنی علیٰحدہ علیٰحدہ صورتوں میں نظمیں ہی ہیں اور یہ مختلف وضع کی نظمیں مختلف زمانوں میں ماحول کے داخلی وخارجی اثرات کے بیش نظر اپنی صورتیں تبدیل کرتی رہی ہیں۔ اردو قدیم نظم اور جدید نظم کا فرق بیان کرتے ہوئے آغا(٦) لکھتے ہیں:

> "نظم ایک کہانی بیان کرتی ہے۔ کبھی یہ کہانی آپ بیتی کا روپ دھارتی ہے اور کبھی جگ بیتی کا۔ قدیم اُردو نظم نے زیادہ تر جگ بیتی کی صورت بیان کی ہے اور اسی لیے اس میں شاعر کی اپنی ذات پوری طرح منعکس نہیں ہوتی۔ لیکن جدید نظم آپ بیتی کے اظہار کی طرف مائل ہے اور اس لیے اس میں ایک انوکھی قوت اور انفرادیت نظر آتی ہے۔ یہی

نہیں بلکہ اس نے فرد کی عام زندگی سے کہیں زیادہ اس کے باطن کے مدھر نغمے کو
گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔"

نظیر اکبر آبادی اُردو میں نظم نگاری کے ایک نئے دبستان کے بانی اور ایک نئے دور کے پیش رو کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی اردو کے پہلے نظم گو شاعر ہیں اور ان کی نظمیں اپنے عوامی اسلوب اور موضوعات کے تنوع کی وجہ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے بے شمار موضوعات پر نظمیں کہیں اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے ان گنت جیتے جاگتے مرقعے اور نمونے پیش کیے، ان کے منفرد اسلوبِ بیاں اور جدید موضوعات کی وجہ سے نظیر کو شاعری کے ایک نئے دبستان کا بانی کہا جاتا ہے۔ نظیر نے ہر صنفِ سخن کو اپنایا اور ان کے کلیات میں غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، مسدس، رباعی، ترجیع بند اور مستزاد سب ہی کچھ ہے۔ ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ قدرتی مناظر، برسات، بادل وغیرہ کے استعمال سے انسانی جذبات کو اُبھارتے نظر آتے ہیں۔

نظیر ایک وسیع المشرب، خوش مزاج اور وسیع دل کے مالک انسان تھے۔ انہوں نے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لیے لکھا اور مسلمانوں کے عرسوں اور تہواروں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے تہواروں، میلوں اور رسموں پر بھی دل کھول کر لکھا۔ بلکہ انہوں نے زندگی کی عام اشیاء مثلاً آٹا، دال اور روٹی پر بھی نظمیں لکھیں اور شاعری میں ان عام موضوعات کو نظم کر کے اپنے وسیع تر مشاہدے کا ثبوت دیا۔

نقوی (۷) لکھتے ہیں:

"نظیر اکبر آبادی کی حیثیت محض شاعر کی نہیں بلکہ ایک مفکر اور مصلح کی بھی ہے۔
انہوں نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا اور انسان کو کامیاب
زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا۔ ان کی شاعری گل و بلبل کی شاعری نہیں بلکہ انسانی
زندگی کی مکمل تصویر ہے جس میں ہر انسان اپنے خدوخال با آسانی دیکھ سکتا ہے۔"

نظیر اردو کے بہترین بیانیہ شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں محسوسات کا نہایت عمدگی اور چابکدستی سے اظہار کیا ہے اور محسوسات ان کی شاعری کا ایک اہم جزو ہیں۔ اس کے علاوہ نظیر کا ذخیرہ الفاظ وافر اور متنوع

ہے۔ نظیر نے اپنی شاعری میں بے شمار موضوعات کو جگہ دی جس کی وجہ سے ان کے ہاں الفاظ کا ذخیرہ بھی بہت وسیع ہو گیا۔ نظیر نے اپنی شاعری میں قومی یکجہتی کے تصور کو اُبھارا ہے۔ نظیر کی شاعری میں موجود قومی یکجہتی کے جذبے پر بات کرتے ہوئے نقوی (۸) لکھتے ہیں:

> "نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعے قومی یکجہتی کے جس تصور کو اُبھارا ہے وہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نظیر رنگ و نسل، قوم و قبیلے اور مذہب و ملت کے اختلافات کو مہمل سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں تمام چیزیں پیدائشی اتفاق ہیں۔ اصل میں جو چیز قابل احترام ہے وہ انسانی ہمدردی اور بے تعصبی ہے۔ یہ چیز اس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب انسان مذہب و ملت، کالے و گورے، ادنیٰ و اعلیٰ اور امیر و غریب کے امتیازات کو بھول کر صرف اور صرف انسانیت کے مضبوط رشتے سے اپنی ذات کو وابستہ کر لے۔"

غرض کہ اردو نظم نگاری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی ایک قد آور شخصیت کے مالک ہے نظیر کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے لیکن انہوں نے خواص کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور وہ عوام اور خواص دونوں کے شاعر ہیں۔

بعد کے سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات نے شعراء کو داخلیت کی طرف مائل کر دیا اور وہ اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ گئے۔ لیکن مندرجہ بالا شعراء کی نظموں کی موجودگی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ حالی اور آزاد کی تحریک سے قبل بھی اردو میں نظم نگاری کا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔

جدید نظم کے فروغ میں سرسید کی کاوشوں اور تحریک نے نمایاں کردار ادا کیا اور ان کی تحریک نے اُردو ادب پر اپنے نمایاں نقوش مرتسم کیے۔ سر سیّد کی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے سرور (۹) لکھتے ہیں:

> "اگر سرسید کی تہذیبی تحریک نہ ہوتی تو شبلی، مولوی شبلی رہتے، مہدی افادی کے الفاظ میں تاریخ کے معلم نہ بنتے۔ آزاد کی کوششوں کو فروغ نہ ہوتا، حالی کی معرکتہ الاراء مسدس نہ لکھی جاتی۔ مقدمہ شعر و شاعری تصنیف نہ ہوتا نذیر احمد کے تمثیلی قصے واقعیت اور مقصدیت کا آغاز نہ کرتے، نہ محمد علی ہوتے، نہ اقبال، نہ ترقی پسند تحریک ہوتی نہ اادبِ عروس زندگی کا شانہ بنتا۔"

گویا انجمن پنجاب کی پہلی اینٹ سر سیّد نے رکھ دی تھی اور اس کی باقاعدہ عمارت محمد حسین آزاد نے کھڑی کی۔ اردو شعر وادب میں فکر و فن کی سطح پر انقلابی تبدیلیوں کا آغاز ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں اور تغیرات کے نتیجے میں ہوا اور جدید اردو نظم کا آغاز ہمیں انجمن پنجاب سے ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی گئی اور اس کا آغاز حکومت وقت کی ایماء پر کرنل ہالرائیڈ کی نگرانی میں ہوا۔ اردو نظم کے فروغ میں انجمن کے مشاعرے ایک یادگار قدم ثابت ہوئے، انجمن کے یہ مشاعرے روایتی انداز سے ہٹ کے ایک نئے رخ اور نئے انداز میں مرتب کیے گئے تھے۔ حالؔی اور آزادؔ ان مشاعروں کے روح رواں تھے۔ جدید انداز کے یہ مشاعرے اردو نظم کی سمت متعین کرنے میں ایک سنگ میل ثابت ہوئے۔

اختر (۱۰) اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کا انجمن پنجاب سے جو گہرا تعلق رہا اور اس نے جس طرح انہیں نظم نگاری کی طرف مائل کر کے جدید شاعری کی طرف راغب کیا اس بناء پر انجمن پنجاب اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل قرار پائی۔"

ان مشاعروں نے اردو شاعری کا مزاج تبدیل کرنے میں بڑا اہم اور نمایاں کردار ادا کیا اس سے قبل مشاعروں میں صرف غزلیں پڑھی جاتی تھیں جب کہ ان کے بعد مختلف موضوعات پر نظمیں پڑھنے کا رواج پیدا ہوا۔ مولانا محمد حسین آزاد کو جدید رنگِ سخن کا بانی کہا جاتا ہے اور نظم جدید کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ان ہی کی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ اردو میں جدید شاعری کے بانیوں میں سب سے قابل قدر شخصیت محمد حسین آزاد کی ہے۔ آزاد نے ہی انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ذریعے جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔

سروری (۱۱) لکھتے ہیں:

> "آزاد کا رتبہ اُردو شاعری میں وہی ہے جو اسکاٹ کا انگریزی شاعری میں ہے کسی نئے خیال کے پیدا کرنے والے اور کسی نئی تحریک کے بانی کو دنیا جس وقعت کی نگاہ سے دیکھ سکتی ہے آزاد اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔ انہوں ہی نے قدیم شاعری کی اصلاح کا

سب سے پہلے بیڑا اٹھایا۔ اورانہوں ہی نے جدید شاعری کا تخم بویا۔ آزاد ہی کی بدولت
نیچرل شاعری کے مفہوم سے لوگ آشنا ہوئے اور آزاد کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر جدید دور
کے سخن طرازوں نے اپنی عمارتیں تعمیر کیں۔"

آزاد کی نظمیں دل کشی کا مرقع ہیں۔ ان کی نظموں میں شعریت کی فروانی اور رنگینی و رعنائی بھرپور ہے۔ استعارے کو باخوبی استعمال کرنا ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے اور تجسیم ان کی پسندیدہ فنی تدبیر ہے۔ یہ آزاد ہی ہیں جنہوں نے نظم کو شعوری تحریک بنایا اوراس کے لیے باقاعدہ پلاننگ کی اور دوسرے شعراء کو بھی نظم گوئی کی طرف مائل کیا۔ یہ نئی نظم کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے آغاز سے ہی ایسے مخلص ساتھی مل گئے جنہوں نے اپنی ساری دانش اور علم وادب کی صلاحیتیں اس کے فروغ میں صرف کر دیں اس طرح نظم کا یہ ترقیاتی سفر آگے بڑھا اور دوسرے دور میں اسے شبلی، اکبر، عبدالحلیم شرر، پنڈت برج نارائن چکبست، عظمت اللہ خان اور اسماعیل میرٹھی جیسے رفیق میسر آئے جن میں سے ہر ایک شعر و سخن کی دنیا میں اپنی مثال آپ تھا۔ اکبر الہ آبادی ایک ایسا شاعر ہے جس نے مغربی تہذیب اوراپنے عہد کی سیاسی و سماجی تحریکوں کے خلاف رد عمل کے لیے اپنی نظم کا سہارا لیا اوراپنی طنز و مزاح سے بھرپور شاعری کے ذریعے شہرت حاصل کی۔ آغا محمد باقر (۱۲) "تاریخ نظم ونثر اردو" میں رقمطراز ہیں:

"اکبر اپنی طرز کے آپ ہی موجد اورآپ ہی خاتم تھے۔ لسان العصر ہونے کے علاوہ وہ
بے مثل شاعر، ناصح قوم اور صوفی صافی تھے۔ حکومت پر نہایت ظریف پیرائے میں
تنقید کرتے تھے اور سیاسیات کو ظرافت میں رنگ کر اپنی بات ایسے مزے میں کہہ
دیتے تھے کہ دیکھنے والے منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔"

اکبر کی وجہ شہرت ان کے کلام میں موجود ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنز ہیں جو وہ معاشرے اور حکومت پر کرتے ہیں ان کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ سے شروع ہوا اور بہت جلد ترقی کے اعلیٰ درجے تک پہنچ گیا۔ اکبر جدید اور لطیف مگر عام فہم تشبیہات کو نہایت دلکش انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ اکبر ایک بہت بڑے نظم گو شاعر اور طنز نگار ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک اہم اور دلکش خصوصیت رمز و کنایہ کا استعمال ہے اور معمولی الفاظ کو ایک نئے اور انوکھے طریقے سے استعمال کر کے لطف پیدا کرتے ہیں اکبر مغربی طرز معاشرت اور انگریزی تعلیم کے بہت

بڑے مخالف تھے اور تصوف اور روحانی تعلیم کی طرف ان کا شروع سے ہی رجحان تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکبر کا تصوف کی طرف رجحان بھی بڑھتا گیا۔ اکبر کے فن پر بات کرتے ہوئے صدیقی (۱۳) لکھتے ہیں:

> "اکبر نے تہذیبِ مغرب کے خلاف مزاحمت کی جو تحریک چلائی، اس میں انہوں نے مزاح کے تمام ہتھیار استعمال کیے مثلاً طنز، پھبتی، شوخی، رمز و کنایہ، تضمین، پیروڈی، لطیفہ اور حسنِ تعلیل وغیرہ ان کا مزاح خیال کا بھی ہے واقعات کا بھی اور الفاظ کا بھی انہیں مزاح نگاری کے تمام گر معلوم ہیں جنہیں وہ مناسب موقعوں پر آزماتے ہیں، عام طور پر وہ افراد کو اپنا نشانہ نہیں بناتے بلکہ اجتماعی روش اور رجحانات پر نظر رکھتے ہیں۔ نئی تہذیب، مذہب، سیاست، آزادیِ نسواں اور بدلتی ہوئی اخلاقی و معاشرتی قدریں ان کے خاص موضوعات ہیں۔"

شبلی نے بھی نئی نظم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اکبر اور شبلی دونوں نے اردو نظم میں مذہبی رنگ بھرا اور اسے دینی و ملّی مقاصد کے لیے استعمال کیا ان دونوں کی طنزیہ شاعری سے اردو نظم کو نئے نئے الفاظ و محاورات ملے اور اس کا کینوس مزید وسیع ہوا۔ اسماعیل میرٹھی نے بھی نظم کے امکانات کو وسعت دینے میں نمایاں کردار ادا کیا انہوں نے بڑوں کے لیے نصیحت آموز اور بچوں کے لیے سبق آموز نظمیں لکھیں۔ ان کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خوبی کلام کی سادگی تھی اسماعیل میرٹھی غیر معروف الفاظ کا استعمال بھی نہایت خوبی سے کرتے تھے۔ مولانا ایک قادالکلام شاعر تھے اور انہوں نے اردو نظم کو مشکل پسندی سے نکال کر سادگی کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ اسماعیل حالی اور شبلی سے متاثر تھے، وہ سرسید کی تحریک کے باقاعدہ رکن تو نہ بنے مگر قوم کی اصلاح اور تعلیم و ترقی میں انہوں نے قابلِ قدر حصہ لیا اور اپنی نظموں میں نوجوانوں کو بیداری، سعی و عمل اور جدوجہد کا درس دیا۔ اسماعیل میرٹھی نے مولانا بخش قلق کے تراجم سے متاثر ہو کر چھ انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کیے۔ تراجم کے اردو شاعری پر ہونے والے اثرات اور نتائج پر بات کرتے ہوئے علیم (۱۴) لکھتے ہیں:

> "قلق میرٹھی کے پندرہ انگریزی نظموں کے منظوم تراجم اور بعد ازاں اسماعیل میرٹھی کے تراجم نے انگریزی شاعری کے دروازے اردو شاعری پر وا کر دیئے۔ ان ترجموں سے متاثر ہو کر دیگر ادبا اور شعراء نے بھی تراجم کی راہ پر سفر کا آغاز کیا۔ طباطبائی نے

> گرے کی مشہور ایلجی کا ترجمہ "گورِ غریباں" کے نام سے کیا۔ لانگ فیلو کی بعض نظموں کے ترجمے بھی طباطبائی نے کیے۔ اکبر الٰہ آبادی کی نظم "روانیِ آب" بھی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔ شرر نے انگریزی ڈراموں کے تراجم آزاد نظم میں کیے اس طرح اردو ادب و شاعری نے نئی زمینیں اور نئے آسمان دریافت کیے اور شعر و ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

اسماعیل میرٹھی نے غزل، قصیدے، سلام اور مرثیے بھی لکھے لیکن ان کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں نظم معریٰ کا آغاز کیا اور نظم معریٰ کی شکل میں بیش بہا خزانہ اردو ادب کو عطا کیا۔ مولانا جدید نظم نگاروں کی محفل میں نہ صرف امتیازی حیثیت کے حامل تھے بلکہ شادیب علیم کے مطابق ان کا نظمیہ شاعری میں ایک ٹرینڈ سیٹر کہنا چاہیئے۔ عبدالحلیم شرر نے ہیت کے بہت سے تجربے کیے اور اردو نظم میں ہیئت کے تجربات کے آغاز کا سہرا ان ہی کے سر بندھتا ہے۔ ان تمام شعراء نے بلاواسطہ اور بالواسطہ دونوں طرح سے نظم کے لیے میدان ہموار کیا اور انجمن پنجاب سے شروع ہونے والا اردو نظم کا یہ سفر بیسویں صدی کے آغاز میں اقبال تک آپہنچا۔ اقبال کی شاعری جدید نظم کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے جمود کو توڑا اور قنوطیت کو رجائیت میں بدلنے کا عملی درس دیا۔ اقبال نے موضوع اور مواد دونوں کے لحاظ سے اردو نظم کو ایک نیا پن دیا اور اس میں اپنے خاص اسلوب سے ایک ندرت پیدا کی۔ اقبال کے فکر و فن پر بات کرتے ہوئے عبدالحکیم (۱۵) لکھتے ہیں:

> "اقبال کے افکار میں اتنا تنوع اور اتنی ثروت ہے کہ اگر اس کے تفکر و تاثر کے ہر پہلو کی توضیع و تشریح اختصار سے بھی کی جائے تو ہزارہا صفحات بھی اس کے لیے کافی نہیں۔ وہ مشرق و مغرب کے کم از کم سہہ ہزار سالہ ارتقائے فکر کا وارث ہے۔"

اقبال نے اپنی نظموں میں ان دشوار سوالات اور الجھنوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ اور منطق سے تھا۔ اقبال کی شاعری بلند تر اخلاقی و سیاسی مقسوم کی حامل ہے اور اقبال نے ہی نظم کو عروج کی منزلوں تک پہنچایا۔ انہوں کے نظم کے نئے امکانات کو تلاش کیا اور فکری و فنی سطح پر اس معراج سے آشنا کیا کہ نظم کو ذات سے نکال کر کائنات تک پھیلا دیا۔ اقبال کے کلام میں ایک قومی درد اور جوش و ولولہ ہے، امید کا درس ہے اور تہذیب و اخلاق کی تزئین کا اہتمام ہے۔ ان کے کلام میں تمام معتبر شعراء کی خصوصیات جمع ہیں۔ اقبال

نے اپنے فکر و فن سے اردو نظم کو ایک خاص وقار عطا کیا اور ایک سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر کے ان کے مردہ تن بدن میں ایک جان ڈال دی۔ اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفہ و فکر کو اس طرح یکجان کیا ہے کہ شاعری کے حسن میں کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے۔

نگار(۱۶) لکھتی ہیں:

> "اقبال اردو شاعری کے سب سے بڑے مصوّر ہیں۔ان کے کلیات کو ایک نمائندہ آرٹ گیلری کہنا بجا ہے جس میں رنگ برنگی صد ہا تصویریں آویزاں ہیں اور ہر تصویر ایسی دلکش کہ ناظر کی توجہ کو جذب کیے لیتی ہے پیکر تراشی کی چار صورتیں ممکن ہیں: ساکت یعنی ٹھہری ہوئی تصویر، متحرک یعنی چلتی ہوئی تصویر، تمثیل جس میں ایک سے زیادہ بے جان چیزوں کو جاندار مان لیا جاتا ہے اور ان کے مکالموں سے ایک ڈرامائی فضا تیار ہو جاتی ہے۔ پیکر تراشی کی آخری اور سب سے اعلیٰ شکل وہ ہے جس میں حرکت و عمل کی ایسی فراوانی ہوتی ہے کہ بالکل ڈرامے کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال کی نظموں میں پیکر تراشی کی یہ چاروں صورتیں موجود ہیں۔"

اقبال نے تمام شعری وسائل کا ہر ممکن استعمال کرتے ہوئے اپنی نظموں میں ایسی دلکشی و رعنائی پیدا کی کہ ان کی شاعری پوری قوم کی آواز بن گئی اور اقبال کا پیغام لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔ اقبال کی نظموں میں ہمالہ، شمع و شاعر، شکوہ، جوابِ شکوہ، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ، خضرِ راہ، ابلیس کی مجلس شوریٰ، ذوق و شوق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تینڈٹ برج نرائن چکبست اردو نظم نگاری کی تاریخ میں قومی شاعر کا درجہ رکھتے ہیں جنہوں نے اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیتیں قومی اور حب الوطنی سے سرشار شاعری اور نظم گوئی پر مرکوز کر دی۔ جوش کا نام بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے جوش کی نظموں میں فطرت نگاری کا رجحان پایا جاتا ہے اور جوش نے مناظر فطرت کو نہایت خوبی اور کامیابی سے پیش کیا ہے۔ جوش کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے، معاملات حسن و عشق کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی اور ملک کو درپیش مسائل جیسے مضامین بھی ان کی نظموں میں نظر آتے ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران اردو ادب میں ایک انقلاب آفریں تحریک "ترقی پسند تحریک" کا وجود عمل میں آیا اس تحریک نے افسانے اور غزل کے ساتھ ساتھ اردو نظم کو بھی جدیدیت کی طرف موڑ دیا۔ ترقی پسند شعراء میں مخدوم محی الدین، اسرار الحق

مجاز، فیض احمد فیض، ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، قتیل شفائی، ظہور نظر، عارف عبد المتین وغیرہ شامل ہیں۔ ترقی پسند شعرا کے پسندیدہ موضوعات ہارے اور کچلے ہوئے طبقہ کی روزمرہ زندگی کے مسائل، طبقاتی کشمکش اور وقومی اہمیت کے مسائل تھے اور ترقی پسند شعراء نے ادب میں مقصدیت پر زور دیا۔ ترقی پسند تحریک کے بعد مغربی علامت نگاری کی تحریک نے بھی جدید نظم پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے پیشوا میراجی مغربی علامت پسند شعرا کو بہت پسند کرتے تھے اس لیے میراجی کی شخصیت کے زیر اثر حلقۂ اربابِ ذوق نے علامت کی تخلیق کے قدیم رجحان کی بجائے نئے مغربی رجحان کو اپنایا اوران رجحانات کو فروغ دیا۔ حلقۂ اربابِ ذوق، ترقی پسند تحریک کے رد عمل کے طور پر قائم کیا گیا اور میراجی کی شمولیت کے بعد یہ رد عمل شدید صورت اختیار کر گیا۔ جاوید (۱۷) لکھتے ہیں:

> "میراجی جب تک حلقے میں شریک نہ ہوئے تھے حلقہ اپنی روایتی شان اور جوش وخروش کے باوجود پھیکا اور سست نظر آتا ہے لیکن جوں ہی میراجی حلقے میں شریک ہوتے ہیں ان کی شخصیت اور شاعری دونوں حلقے پر تیزی سے اثرانداز ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ میراجی ہی تھے جن کی وجہ سے حلقۂ اربابِ ذوق میں ایک تحرک پیدا ہوا اور دوسرے ادیب وشاعر اس تحریک میں معاون وشریک ہوتے چلے گئے۔ بہت جلد وہ حلقۂ اربابِ ذوق میں ایک بنیادی اہمیت رکھنے والی شخصیت قرار پا گئے اور حلقے کو سجانے سنوارنے میں جو تجاویز انہوں نے پیش کیں ان کا احترام کیا گیا اور بعد میں انہی تجاویز ہو حلقے کے قوانین کا درجہ حاصل ہو گیا۔"

ارباب ذوق کے شعراء میں میراجی کے علاوہ قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی فعال نظر آتے ہیں۔ ترقی پسندوں اگر نظم میں زندگی، کسان، مزدور، برسات، آسمان جیسے موضوعات لائے تو حلقۂ اربابِ ذوق کے شعراء نے خلوت، سراب، روشنی اور سمندر جیسی اچھوتی اور فکر انگیز علامات کو نظم کا موضوع بنایا۔ بیسویں صدی کا نصف اوّل نظم گوئی کا دور سمجھا جاتا ہے اگرچہ اس دور میں غزل بھی لکھی جاتی رہی لیکن نظم نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ اس دور میں چند ایسے منفرد شعرا بھی تھے جو کسی تحریک کا حصہ نا بنے بلکہ انہوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے نظم میں نت نئے تجربات کیے۔ ان شعراء میں تصدق حسین خالد، ن م راشد، مجید امجد، شاد عارفی اور اختر

الایمان قابل ذکر ہیں۔اردو میں آزاد نظم کی ابتدا تصدق حسین کی نظموں سے ہوتی ہے اور خالد کی آزاد نظم پر انگریزی آزاد نظم کی تکنیک کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے مگر آزاد نظم کو فروغ دینے میں سب سے نمایاں کام ن م راشد کا نظر آتا ہے اور راشد نے ہی آزاد نظم کی عمارت کو مضبوط کیا۔اردو نظم کا سفر مسلسل اور بتدریج ارتقا سے دوچار ہوا اوراس سفر میں نظم کئی منزلوں سے گزری۔ایک عرصہ تک خارجی مسائل وواقعات کی عکاس بنے رہنے کے بعد اس نے داخلیت کی طرف بھی سفر کیا۔اس سلسلے میں آغا(۱۸)رقمطراز ہیں:

"اردو نظم ایک طویل عرصہ تک خارجی مسائل،مقاصد اور نقطہ ہائے نظر کے تحت تخلیق ہوتی رہی تھی لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے اپنی اصل جہت دریافت کر لی اور بتدریج خارج کو باطن سے منسلک کرتی چلی گئی۔جدید اردو نظم میں یہ جہت پوری طرح منظر عام پر آئی ہے لیکن ان تمام پہلوؤں کے باوصف اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ غواصی کا یہ عمل شاعر کی مخصوص افتادِ طبع کا منت کش بھی ہے۔جدید اردو نظم کے حق میں یہ نیک فال ہے کہ میراجی کے بعد اسے درجنوں ایسے شعراء مل گئے جن کے ہاں باہر سے اندر کی طرف آنے کی نہج بہت نمایاں تھی۔مثلاً یوسف ظفر،قیوم نظر، مجید امجد،اخترالایمان،مختار صدیقی،ضیاءجالندھری،جذبی،منیب الرحمنٰ،انجم رومانی، محمد صفدر،وشو امتر عادل،سید فیضی،منظر سلیم،سلام مچھلی شہری،تخت سنگھ،مخمور جالندھری،سردار انور،الطاف گوہر اوران کے بعد بلراج کومل، عارف عبد المتین،ظہور نظر،ابن انشاء،فارغ بخاری،جمیل ملک،قاضی سلیم،شہزاد احمد،منیر نیازی،خلیل الرحمنٰ اعظمی،احمد فراز،شاذ تمکنت،شاد امرتسری اور پچھلے چند سالوں میں عرش صدیقی،شکیب جلالی،نور بجنوری،شہریار،ساقی فاروقی،نذیر ناجی،جیلانی کامران،شہاب جعفری،ادیب سہیل،احمد شمیم،کرشن ادیب،محمد علوی،صلاح الدین ندیم،کمار پاشی،مخمور سعیدی،رحمان فراز،سلیم الرحمنٰ،عمیق حنفی،بشیر نواز،عزیز تمنائی اور درجنوں دوسرے شعراء نے اس نہج کو اپنایا ہے۔"

جدید نظم کے سلسلے میں اور بھی بہت سے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔شعراء کی ایک بڑی جماعت نئی نظم کی علمبردار رہی اوراس کی ترقی و فروغ میں انہوں نے معاون کردارادا کیا۔ان میں زیادہ اہم احمد ندیم قاسمی،حبیب

جالب، عزیز حامد مدنی، وزیر آغا، امجد اسلام امجد، خورشید رضوی، احمد فراز، پروین شاکر، کشور ناہید، تبسم کاشمیری، انور مسعود، محسن نقوی، جمیل ملک، شبنم شکیل، سعد اللہ شاہ، فرحت عباس شاہ، فیصل عجمی، سہیل احمد، اقبال کوثر، ناہید قاسمی، نصیر احمد ناصر، نسرین انجم، علی محمد فرشی، منصورہ احمد، شاہین مفتی، افضال احمد، جواز جعفری اور مبارک احمد کے نام اہم ہیں۔

اوپر کے صفحات میں جدید اردو نظم کے اجمالی جائزہ کے نتیجہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی جدید اردو نظم کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوئی اور اردو نظم کو مقبول بنانے میں بہت سی تحریکوں اور زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات نے نمایاں کردار ادا کیا اور بیسویں صدی کے اردو ادب میں نظم نے خوب ترقی کی۔ اردو نظم کو بہت سے ذہین اور توانا دماغ نصیب ہوئے جنہوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے تمام رجحانات کو خوش اسلوبی سے نظموں میں ڈھال دیا۔ نظم کا یہ ارتقائی سفر اب بھی تیزی سے جاری وساری ہے۔ نظم کی اس روایت کو اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے نظم نگاروں نے بھی کافی حد تک مضبوط کیا ہے اور اس تقویت پہنچائی ہے اور ان نظم گو شعراء میں شہزد نیّر کا بھی شمار ہوتا ہے۔

شہزاد نیّر کی نظم نگاری کا تنقیدی جائزہ:

شہزاد آزاد نظم کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے آغاز میں پابند نظمیں لکھی اور پابند نظم سے ہی شاعری کا آغاز کیا مگر بعد میں آزاد نظم کا سحر ان پر ایسا طاری ہوا کہ انہیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اس سے بہتر صنف اور نہ لگی۔ اپنے ایک انٹرویو میں نیّر (۱۹) بتاتے ہیں:

> "سکول کے زمانے میں جب شاعری کرتا تھا تو پابند نظمیں لکھتا تھا۔ پھر میں نے ن م راشد کی نظمیں پڑھیں تو مجھے آزاد نظم نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ میں اس کے آہنگ میں کھو گیا تو تب میں نے سوچا کہ آزاد نظم میں اپنے خیالات کو مربوط انداز میں بیان کرنے کی سہولت ہوتی ہے۔ نئے عہد کے جدید خیالات واحساسات کو آزاد نظم کی صورت میں بیان کرنا زیادہ بہتر لگا۔ اس لیے میں نے آزاد نظم کو اپنی شاعری کے لیے چنا۔"

آزاد نظموں کے ساتھ ساتھ شہزاد نے کچھ پابند نظمیں اور دوسری اصناف مثلاً نعت، منقبت اور طویل نظم کی صورت میں بھی اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ نظم کی یہ اصناف متنوع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف ہیں۔ ان میں طبع آزمائی کرتے ہوئے ایک طرف تو شہزاد نے اپنے قادر الکلام شاعر ہونا ثابت کیا ہے وہیں ان تمام اصناف میں ان کی شاعرانہ مہارت انہیں ایک بڑے نظم نگار کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مخصوص اصنافِ سخن کے لحاظ سے بھی ان کے کام کا علمی و تحقیقی جائزہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں ان اصناف کے لحاظ سے شہزاد کی نظم کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ شہزاد کی نعتیہ شاعری

شہزاد نے آزاد نظم کے علاوہ دوسری اصنافِ نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے جو کہ ان کے ایک اچھے شاعر ہونے کا ثبوت ہے۔ تمام مسلمان اپنے پیارے نبی ﷺ کی مدح اور تعریف کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں اسی وجہ سے مسلمان شعراء نے نعتیہ شاعری کی ہے اور اس بابرکت صنفِ سخن میں اپنے کمالات کے جوہر دکھائے ہیں۔ ورک (۲۰) نعت کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "نعت عربی زبان کا وہ لفظ ہے جس کے معنی تعریف کرنا کے ہیں، لیکن اصطلاحاً یہ لفظ مدحتِ رسول کے لئے وقف ہو چکا ہے۔ جہاں تک نعت کا تاریخی معاملہ ہے اس کا آغاز آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں ہی ہو گیا تھا اور یہ سلسلہ آج تک پورے تزک و احتشام کے ساتھ جاری ہے۔"

نعت نگاری کی باقاعدہ ابتداء نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی اور دنیا کی پہلی نعت حضرت ورقہ بن نوفل نے کہی۔ نعت نگاری کے فن میں حضرت حسان بن ثابت بہت مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ اردو میں نعت کا آغاز دکن سے ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان ایسے شعراء ہیں جنہوں نے نعت پر بہت کام کیا۔ غرض کہ اردو زبان میں نعتوں کا نہایت وسیع اور قابل فخر ذخیرہ موجود ہے۔ شہزاد نیّر نے بھی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ نعت کے میدان میں بھی اپنے فن کی مہارتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔

"جبینِ عصرِ رواں پہ انگشتِ نور سے جب

وہ سطرِ روشن لکھی گئی ہے

حروفِ تاباں بصیر آنکھوں نے چن لیے تھے

لبِ فلک سے وہ لفظ پیارے

وہ نور پارے اتر رہے تھے

سماعتِ نیک خُو میں تارے سمٹ رہے تھے

وہ بابِ روشن کھلا ہوا تھا

جہاں مسلط مبارزت کے اصولِ زریں

ورق ورق پر چمک رہے تھے

وہاں زن و طفل و ناتواں پیر کو اماں تھی

درِ مقفل کا ذکر کیا ہو، نیام شمشیر کو اماں تھی

کہا: ثمر دار پیڑ، فصلیں، شجر سلامت کھڑے رہیں گے

نہ کوئی خیمہ نہ گھر جلے گا

عُدو کے معبد کھڑے رہیں گے

سلام ان پر وہ کہہ رہے تھے

تو گوشِ امن و اماں میں تارے اُتر رہے تھے

وہ نطقِ رحمت کے ضابطے ہیں

یہ کس قیامت کے ضابطے ہیں

کہ طفل و پیر و جواں کو یکساں لہو کے پیکر میں ڈھالتے ہیں

یہ کون ہیں جو گلوئے آدم پہ داغ ہائے رسن سجائے

جب ارضِ لشکر کو لُوٹتا ہے

تو حاکمِ وقت اس کے ہاتھوں کو چُومتا ہے

وہ کون تھے جو حروفِ رحمت سے لفظ یلغار بُن رہے تھے

سلام اُن پر

وہ کہہ رہے تھے تو ارض و افلاک سُن رہے تھے"

(۲۱)

شہزاد کی نعت رسول مقبول ﷺ بھی ان کے اسلوب کی انفرادیت کی طرف واضح اشارہ ہے کہ کس طرح انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی پُرنور شخصیت کی تعریف بیان کرنے کے بعد آج کے انسان پر سوال اُٹھایا ہے۔ایک طرف حضور اکرم کی ذات مبارکہ تھی جو اپنوں کے ساتھ ساتھ غیروں کے لیے بھی جائے اماں تھے اور جو رحمت للعالمین تھے اور دوسری طرف آج کا انسان اور ان کے بنائے گئے خود ساختہ ضابطے ہیں اور وہ تلواروں اور بارودوں کی یلغار میں زندہ ہیں۔ آج کے انسان نے نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے اپنی تربیت کا اہتمام کرنا چھوڑ دیا ہے۔شہزاد نے اپنی نعت میں نہایت خوبصورت اور دلکش الفاظ، تراکیب اور استعارات کا استعمال کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

جب ظلم سے زمین کو کالا کیا گیا
فاراں کی چوٹیوں سے اجالا کیا گیا
اس خاک نیک بخت نے نعلین کیا چھوئے

یثرب کو دو جہاں سے اعلیٰ کیا گیا
بھیجا گیا وہ رشکِ قمر یوں زمین پر
تاروں کو اس کے نور کا ہالہ کیا گیا
لا وقت میں فضلیتِ معراج بخش کر
ان کو مرے شعور سے بالا کیا گیا
عقلِ بشر میں خوئے گدائی کو دیکھ کر
دستِ نبی ﷺ کو بانٹنے والا کیا گیا
صد شکر اہتمام عروجِ نظر ہوا
صد شکر ذکرِ احمد ﷺ بالا کیا گیا

درج بالا نعت مبارکہ شہزاد کی شاعری میں نہایت خوبصورت مقام و مرتبہ کی حامل ہے جو ان کی فنی مہارت کی بھی گواہی دے رہی ہیں۔ اس نعت میں انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے تقریباً تمام پہلوؤں کا نہایت خوبی کے ساتھ جائزہ پیش کرتے ہوئے ان سے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے، معروف اور تعریفی کلمات کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی زندگی کے کئی ہم پہلوؤں کو بھی نہایت اختصار اور خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ شہزاد نے نہایت جدت اور تنوع کے ساتھ اردو کی نعتیہ شاعری کے ذخیرے میں موضوعی اعتبار سے اضافہ کیا ہے۔

۲۔ شہزاد کی منقبت نگاری:

منقبت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی تعریف اور بزرگی بیان کرنا کے ہیں اور یہ اصطلاح صحابہ کرام، اہلِ بیت یا بزرگانِ دین کی مدح بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ منقبت کے لیے کسی ہیئت کی پابندی لازمی نہیں ہوتی بلکہ یہ قطعہ، نظم اور مثنوی کسی بھی ہیئت میں لکھی جا سکتی ہے۔ اردو شاعری میں منقبت نگاری کی طرف بھی شعراء کا ہمیشہ سے ہی رجحان رہا ہے۔ اردو میں منقبت نگاری کا آغاز بھی قلی قطب شاہ سے ہوتا ہے اس کے بعد مرزا رفیع الدین سودا، انشاء اللہ خان انشاء، نظیر اکبر آبادی، امیر مینائی اور محسن کاکوری نے اس صنف میں قابلِ

قدر اضافے کیے۔ شہزاد نے اس صنف میں اپنے فن کو آزمایا ہے اور حضرت امام حسین سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے منقبت لکھی ہے۔ اس منقبت کا عنوان "سلام" ہے۔

طریقِ صبر و رضا کیا اختیا ر مولا
وگرنہ زخموں کا آپ کرلے شمار مولا
کوئی فلک سے کہے کہ ریگِ تپاں پہ اُترے
زمیں پہ آتا ہے اب مرا شہ سوار مولا
ہراک ساعت رہے گا بیدار بخت ان کا
جو سو رہے ہیں مرے یہ شب زندہ وار مولا
سناں پہ سورج ہی روشنی کا جواز کھولے
گھنیری ظلمت میں گھِر گیا ہے دیار مولا
بدن کے پنجرے کو توڑ، تیرے حضور پہنچوں
بس اک ساعت کا ہے مجھے انتظار مولا
ثنائے آلؑ عبا کا ریشم لپیٹتا ہوں
دعا میں چنتا ہوں گوہرِ اعتبار مولا
تری حضوری میں بازیابی کی منتظر
جو بھیج رکھی ہے آنسوؤں کی قطار مولا

(۲۲)

"سلام" ایک عمدہ منقبت ہے جو بابِ دعا آن لائن میگزین میں شائع ہو چکی ہے۔ اس منقبت میں شاعر بار بار امام عالی مقام سے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں اور تمنائی ہیں کہ کب بدن کی قید سے آزاد ہو کر ان سے ملاقات کر سکوں گا۔ سلام کے ان اشعار میں ایک فطری بہاؤ اور آہنگ ہے اور اس آہنگ میں عقیدت و جذبات کی خوشبو ملی ہوئی ہے۔ آہنگ کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت فکری تنوع کا احساس بھی ان اشعار کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔

۳۔ شہزاد کی طویل نظمیں:

اردو میں طویل نظم اپنے منفرد مزاج اور اسلوب کے جداگانہ خدوخال کے ساتھ اُبھری ہے اور اس صنف نے اظہاریے کو مختصر مزاج سے نکال کر وسعت آشنا کیا ہے۔ طویل نظم کہنا ایک مکمل کیفیت یا رجحان کا نام ہے جو فن پر مکمل عبور کے بغیر ادھورا اور نامکمل ہے۔ طویل نظم کسی لمحاتی کیفیت کے تحت نہیں لکھی جاتی بلکہ بلند تخیل اور جذبہ کی کثرت ہی اسے زندگی عطا کرتی ہے۔ طویل نظم کا موضوع ایک درخت کی شاخوں کی طرح ہوتا ہے جو جتنا زمین کے باہر پھیلی ہوتی ہیں اتنی ہی ان کی جڑیں زیرِ زمین بھی گہری ہوتی ہیں۔ اردو شاعری میں مثنوی، مرثیہ اور قصیدے کی شکل میں طویل نظم کی روایت تو شروع سے ہی موجود تھی مگر اردو شاعری میں جیسے جیسے نظم کو فروغ حاصل ہوتا گیا ویسے ویسے ہی جدید نظم نگاروں نے طویل نظم کی صنف کو بھی جدت آرا کیا۔ حالی کی "مدوجزراسلام" کو دورِ جدید کی پہلی طویل نظم کہا جاتا ہے۔ اقبال نے بھی اس صنف کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور "شکوہ"، "جوابِ شکوہ"، "طلوعِ اسلام"، "ساقی نامہ" اور "مسجدِ قرطبہ" جیسی عظیم الشان نظمیں تخلیق کی۔ ترقی پسند شعراء میں سے سردار جعفری، نیاز حیدر اور ساحر لدھیانوی نے بھی طویل نظمیں لکھیں۔ طویل نظم کی روایت میں اختر الایمان اور ن م راشد نمایاں مقام و مرتبہ کے حامل ہیں راشد کی "حسن کوزہ گر" اور اختر الایمان کی "جیونی" طویل نظم کی روایت پر ایک پائیدار نقش ثبت کرتی ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد طویل نظم کی روایت ایک نئے دور میں داخل ہوئی اور طویل نظم لکھنے والوں نے نثر اور نظم کی کئی صنعتوں مثلاً داستان، آب بیتی، سفر نامے اور شہر آشوب کی گنجائش طویل نظم میں پیدا کی۔ سلیم احمد کی "مشرق" جیلانی کامران کی "استانزے" عمیق حنفی کی "شہر زاد"، "پتھروں کی اتما" اور "سندباد" وحید اختر کی "شہر بوس" اور "مشرق" ضیا جالندھری کی "زمستان کی شام" اور "سالمی" فہمیدہ ریاض کی "کیا تم پورا چاند دیکھو گے" اور وزیر آغا کی "آدھی صدی کے بعد" یہ سب جدید اردو طویل نظم کے منظر نامے میں خصوصی اہمیت اور جدت کا احساس لیے ہوئے ہیں۔ یہ نظمیں تجربے اور طرزِ اظہار دونوں کا نیا پن لیے ہوئے ہیں۔ ضیا جالندھری اور وزیر آغا کا شمار طویل نظم کے رجحان ساز شعرا کے طور پر کیا جاتا ہے اور اب شہزاد موجودہ دور میں طویل نظم کی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے سلہری (۲۳) لکھتے ہیں:

"جس جدید طویل نظم نگاری کا آغاز ضیا جالندھری نے۱۹۹۶ءمیں "زمستاں کی شام" لکھ کر کیا تھا وہ اب اکیسویں صدی میں شہزاد نیّر جیسے نظم نگاروں نے جاری رکھا ہوا ہے جنہوں نے ضیا جالندھری کی طرح اپنے پہلے خالص نظمیہ مجموعے "برفاب" میں ایک طویل نظم "خاک" لکھ کر جدید طویل نظم نگاری کی رویت کو کمزور نہیں پڑنے دیا۔ان کے تیسرے شعری مجموعے "گرہ کھلنے تک" میں بھی ایک طویل نظم "نوحہ گر" شامل ہے۔جدید طویل نظم نگاری کا جو سلسلہ ضیاء جالندھری کی نظم "زمستاں کی شام" سے شروع ہوا تھا وہ شہزاد نیّر کی نظموں "خاک" اور "نوحہ گر" میں اپنے عروج پر پہنچتا نظر آتا ہے۔"

خاک شہزاد کی پہلی طویل نظم ہے جو انہوں نے پانچ سال میں مکمل کی اور یہ نظم ۲۰۰۵ء میں "کاغذی پیرہن" رسالے میں شائع ہوئی۔اس رسالے کے مدیر شاہد شیدائی تھے۔انہوں نے "اردو کی بہترین نظم" کے عنوان سے چھاپا اور ایک ادارتی نوٹ بھی اس نظم پر لکھا۔اس کے بعد جب شہزاد کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا تو اس میں بھی اس نظم کو شامل کیا گیا۔اوس نظم میں شاعر نے ایک ماہر کہانی کار کی طرح ایک پوری کہانی کو نظم کی شکل میں بیان کیا ہے۔اس نظم کی کہانی مختصراً کچھ اس طرح ہے کہ دو قدیم ممالک کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کے بعد کچھ لوگوں کو ایک پرانی لاش ملتی ہے جو مکمل طور پر برف میں لپٹی ہوئی ہے۔

"وہاں، جَوفِ دریا کے اُوپر

کوئی چیز دکھنے لگی!"

"ہاں کوئی چیز ہے

آؤ، دیکھیں سبھی!

اُف خُدا، یہ تو انسان ہے!"

(ص۱۲۵)

یہ لاش ایک عسکری کی ہے جو اپنی ریاست کی طرف سے لڑی جانے والی لڑائی میں مارا گیا تھا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ایک رسے کے ذریعے محاذِ جنگ پر جا رہا تھا کہ موسم کی شدت سے برف ٹوٹی اور وہ پھسل کر کھائی میں جا گِرا۔

چار جسموں کو رسی سے باندھا گیا

جسم چلنے لگے

چیخ اُٹھی ہوا

(ص ۱۳۵)

اس کے ساتھیوں نے اسے بچانے کے لیے کھائی میں رسہ پھینکا مگر وہ اس تک نہ پہنچ سکا۔ اس نے اپنے آخری وقت میں اپنے ساتھیوں کو کچھ وصیتیں بتائی اور اپنے پیاروں کے لیے چند پیام دیئے۔ اب وہ عسکری ان لوگوں سے اپنے لیے مٹی کی چادر مانگتے ہوئے کہہ رہا ہے:

وقت کی مہربانی سے اُبھرا ہُوں میں

مہربانی کرو،

گرم آغوش دھرتی کی دے دو مجھے

ایک مٹی کی چادر ہی لے دو مجھے!

(ص ۱۴۵)

شہزاد کی یہ نظم جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کا نہایت بہترین مرقع ہے اس میں شاعر نے ایک فوجی کے جذبات و حالات کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے اور جنگی نقصانات پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فتح محمد (۲۴) رقمطراز ہیں:

"خاک" اردو کی چند ایک طویل نظموں میں گراں قدر اضافہ ہے۔اس کے ماحول اور جغرافیائی حدود کا بیان شاید بیشتر شعرا کے دست رس سے باہر ہے۔اس نظم کی گہرائی میں کئی کہانیاں بہتی ہیں۔ یہ نظم دراصل سمندروں میں چلتی گرم اور ٹھنڈی روؤں کی طرح ہے۔"خاک" منجمند پہاڑوں کی کہانی ہے جہاں سورج کی شعاعیں بھی جم جانے کے خوف سے نہیں اُترتیں اور اگر اُترتی ہیں کو انہیں وہاں سے نکل جانے کی جلدی ہوتی ہے مبادا کہ وہ جم جائیں۔"

کسی بھی فن پارے کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اس فن پارے کا خمیر انسانی زندگی سے اٹھایا گیا ہے یا نہیں ؟اوراس فن پارے کی کیا ہیئت ہے ؟طویل نظم خاک ایک اعلیٰ فن پارے کی تمام خصوصیات سے لبریز ہے۔بہت کم ایسے فنکار ہوتے ہیں جو زندگی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر ان میں سے اپنے پسندیدہ نظارے چن لیتے ہیں اور پھر ان نظاروں کو اپنے فن سے زندہ کر دیتے ہیں۔ رنگوں اور نظاروں کا یہ چناؤ ہی کسی شاعر یا ادیب کے فن پارے کی کامیابی کی ضمانت ہے۔شہزاد نے اس نظم میں انسانی جذبات کی بھرپور ترجمانی کرنے کے ساتھ ان میں زندگی کا عکس پیش کیا ہے۔یہ جذبات تضادات کا مجموعہ ہیں اوران کے اندر ایک ہی وقت میں محبت اور نفرت کے جذبے دونوں کار فرما ہیں۔ شہزاد نے انسانی رویوں اور جذبات کے تغیر کی تاریخ کی طرف اشارہ کر کے قاری کے لیے سوچنے کے کئی دروازے کھولے ہیں۔ شہزاد کے کہانی کے تمام تانے بانے اس طرح باہم ملا دیے ہیں کہ کہانی کا کوئی سِرا ادھورا دکھائی نہیں دیتا۔ ناظر (۲۵) لکھتے ہیں:

"طویل نظم "خاک" اردو ادب کی بہترین طویل نظموں میں شامل ہو گئی ہے۔یہ پہلی قرات میں ہی یہ تاثر قائم کر لیتی ہے۔گہرے مطالعے کی متقاضی یہ نظم تمثال کاری، منظر نگاری اور لفظیاتی اسلوب کے حوالے سے غیر معمولی نظم ہے۔اس سے شہزاد نیّر کو اپنی نسل کے اہم اور نمائندہ نظم گو ہونے کا اعزاز مل چکا ہے۔"

"نوحہ گر" شہزاد کی دوسری طویل نظم ہے جو کہ انہوں نے چار سال میں مکمل کی اور یہ نظم شہزاد کے تیسرے شعری مجموعے "نوحہ گر" میں شامل ہے۔اس کے علاوہ یہ نظم کتابچے کی شکل میں بھی چھپ چکی ہے۔ اس نظم میں شہزاد نے وقت کی زبانی اس کائنات کے وجود میں آنے اور زندگی کے آغاز کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ شہزاد

کی یہ نظم ان کے اندر رچے بسے ہوئے تاریخی اور عصری شعور کا پتا دیتی ہے اوراس نظم کے ذریعے شہزاد نے بے قید وقت کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے انسانی تاریخ کا نوحہ رقم کیا ہے۔ جہاں (۲۶) لکھتے ہیں:

> "طویل نظم "گرہ کھلنے تک" ایک داستان ہے جو کہ ناموجود سے موجود تک کے تمام مظاہر کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔ سب سے منفرد بات جو مجھے لگی کہ اس میں شہزاد نیّر نے خود کو ایک ایسا کردار دیا ہے جو کہ ناموجود سے موجود تک کی تمام وارداتوں کو نہ صرف مشاہداتی نظر سے دیکھ رہا ہے بلکہ ان پر نوحہ کناں بھی ہے۔ اس نظم میں جہاں انہوں نے جہانِ کن کی داستان کو ایک نیا لب لہجہ دیا ہے وہاں ان کی فن پر دسترس کا اظہار بھی کھل کر سامنے آیا ہے۔ سائنسی عوامل کو نہ صرف اپنی زبان میں نہایت عمدگی سے ترجمہ کیا گیا بلکہ لسانیات کو ایک نیا اور شائستہ رخ دیتے ہوئے مرصع کاری سے شعری قالب کے مطابق زبان و بیان کو وضع کیا گیا ہے جو کہ واقعی ایک منفرد کام ہے۔"

شہزاد نیّر کی یہ نظم ان کے اندر رچے ہوئے تاریخی اور عصری شعور کو واضح کرتی ہے اور اس نظم کے ذریعے شہزاد نے بے قید وقت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ نظم میں کائنات کے آغاز وارتقاء کی مکمل کہانی بیان کی گئی ہے کہ یہ کائنات جو پہلے معدوم تھی جہاں کچھ بھی نہ تھا کس طرح ایک لمحے کے پھسلاؤ سے وجود میں آئی۔

کچھ بھی نہ تھا

روشی، تیرگی، سمت آواز۔۔۔سب نیستی!

بے وجودی کے معدوم سے

"کچھ نہیں" کی عدم دوش چوٹی سے

بس ایک لمحے کا پھسلاؤ

سمت آشنا غیر مادے سے ٹکراؤ

نقطے کا پھیلاؤ"ہونے "میں بدلا

(گرہ کھلنے تک ص۱۱۹)

نظم میں شہزاد کی اپروچ منطقی اور سائنسی ہے اور اس نظم میں شہزاد نے کئی سائنسی تھیوریز بھی بیان کی ہیں جیسا کہ بگ بینگ تھیوری۔اس نظریے کے مطابق کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے تمام مادہ ایک سوئی کے ہزارویں حصے کے برابر نہایت خفیف جگہ میں قید تھا پھر تمام مادہ ایک دھماکے کے بعد انتہائی تیزی سے ایک دوسرے سے دور ہونے لگا اور تیزی سے پھیل گیا جس سے یہ کائنات تیزی سے پھیلنے لگی۔شہزاد نے اس نظم میں سائنس کو بھی رومانس بنادیا ہے۔ نظم میں سائنس کے ساتھ ساتھ لسانیات،تواریخ اور انسانی ارتقاء کے اور بھی بہت عوامل کو بیان کیا گیا ہے۔ابراہیم(۲۷)لکھتے ہیں:

> "یہ نظم کہانی ہے نیستی سے ہستی ہونے اور پھر اس ہستی کے بستی بسانے کی،خوف کی زمین سے دیوتاؤں کو ایک خدا میں سمانے کی اور پھر آباد بستیوں کو مذہب کے نام پر برباد کرنے کی۔یہ المیہ ہے زمین و زمان کا جس کی جڑیں ہم آج بھی آسمان میں ڈھونڈنے پر تُلے ہیں۔آسمان۔۔کہ جو محض آنکھ کا گمان تھا اسے مقدس صحائف نے "یقینی بیان" کے مقام پر براجمان کیا مگر اب تصورِ فلک علمی تحقیق کے میدان میں بے امان ہے۔"

شاعر کے مطابق خدا ایک ایسا لفظ اور خیال ہے جس کے گرد انسان نے عقیدت کے مینار تعمیر کیے ہوئے ہیں اور پھر اس عقیدت کو ہتھیار بناتے ہوئے وہ زمین اور دولت کے لالچ میں دوسرے انسانوں کا گلا کاٹنے میں مصروف ہے۔پوری نظم میں شاعر ایک کردار کے طور پر نظر آتا ہے جس کی آنکھیں جگہ جگہ انسانی تاریخ کا نوحہ رقم کرتی ہیں۔یہ نظم فکری پہلوؤں کے ساتھ ساتھ فنی لحاظ سے بھی تمام لوازمات سے مالامال ہے۔

شہزاد کی آزاد نظم:

آزاد نظم قافیہ وردیف سے آزاد ہوتی ہے اور اس میں سر اور تال کے لحاظ کے ساتھ چھوٹے بڑے مصرعوں کی صورت میں نظم مکمل کی جاتی ہے۔مصرعوں کے ارکان ہم وزن ہوتے ہیں مگر ایک مصرعے میں ارکان کی تعداد

مقررہ نہیں ہوتی اور شاعر ہئیت کی پابندیوں سے آزاد ہو کے مکمل آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کو چھوٹے بڑے مصرعوں میں پیش کرتا ہے۔ خیال کی پُرکاری اور سادگی کے ساتھ ساتھ موسیقیت اور غنائیت آزاد نظم کی خصوصیات ہیں۔

آزاد نظم کی افادیت اور اہمیت پر بات کرتے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں شہزاد (۲۸) بیان کرتے ہیں:

> "آپ کو اپنے مزاج کے مطابق شاعری کی قسم کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ شاعری کی صنف کی مقبولیت اس دور کے حالات کے تابع بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ آج کے دور کے مزاج کو آزاد نظم ہی بہتر طریقے سے expose کر سکتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنے لیے آزاد نظم کو بہتر سمجھا۔"

شہزد نظم کے ایک بلند مرتبہ اور بلند خیال شاعر ہیں اور انہوں نے نظم کے تمام فنی و فکری پہلوؤں کو خوش اسلوبی سے نبھاتے ہوئے اردو نظم کے میدان میں اپنی کامیابی کا مظاہرہ کیا ہے اور فتح یاب قرار پائے ہیں۔ آزاد نظم کے میدان میں شہزاد کا کردار ایک بہادر اور ماہر سپاہی کا سا رہا ہے اور انہوں نے آزاد نظم نگاری میں خاصا کمال پیدا کیا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

شہزاد کی نظم کا فکری اور موضوعاتی جائزہ:

شہزاد کی شاعری درد اور احساس کی شاعری ہے اور ان کی نظمیں فطری خوب صورتی، الفاظ کی عمدہ دروبست اور ارفع خیالات سے بھری پڑی ہیں۔ شہزاد کی شاعری آج کے انسان کے لیے لکھی گئی شاعری ہے اور ان کا اظہاریہ بہت مشاہداتی اور سچائی پر مشتمل ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات میں بہت زیادہ تنّوع دیکھنے کو ملتا ہے۔

قریشی (۲۹) لکھتے ہیں:

> "شہزاد کی نظمیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ احساس کی سولی پر مصلوب یہ شاعر جب زمانے بے حمیتی اور اجتماعی بے حسی پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کا باطنی شعور اور انسان دوست رویہ انی چبھو کر کہتا ہے کہ اُٹھ اور خاک کا نوحہ رحم کر۔ اس کہ بعد کوئی واقعہ، کوئی

منظر، ایک چبھتا ہوا جملہ یا ذاتی تجربہ شاعری کے عمل کو Trigger off کرتا ہے تب
ایک نظم وجود پاتی ہے۔"

ذیل میں ان کی نظموں کا فکری جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

سماجی موضوعات:

شہزاد کی شاعری ایک باشعور انسان کی شاعری ہے جس نے زندگی کے سبھی حالات وواقعات اور مصائب کو خود پر جھیلا ہے اور جو زندگی کے سبھی ادوار سے ایک باہمت انسان کی طرح گزرا ہے۔ شہزاد نے بطور شاعر زندگی کا پڑا گہرا اور عمیق مشاہدہ کیا ہے اور اس مشاہدے کی جھلک ان کی نظموں میں جا بہ جا نظر آتی ہے۔ شہزاد نے اپنی نظموں میں ان تمام موضوعات کو بیان کیا ہے جو ایک انسان کو اپنی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات میں ایک طرف تو انسان کے ذاتی کرب اور احساسات کو بیان کیا ہے تو دوسری طرف بحیثیت مجموعی بطور عوام بھی ان کے مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ شہزاد کی فکر آج کے انسان کو درپیش مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ شہزاد ایک نظریاتی شاعر ہیں اور ان کا نظریہ ابتداء سے لے کر موجودہ دور تک جاری طبقاتی کشمکش، تفاوت اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ شہزاد کی نظموں میں معاشرتی بے حسی، سماجی بے انصافی، غربت، معاشی بے اطمینانی اور معاشی استحصال کا واضح تصور ملتا ہے۔ نظم "کبھی سورج بھی نکلے گا" میں دیہاڑی دار مزدوروں کی حالت بیان کی ہے کہ جو صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی مزدوری کی تلاش میں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کے کپڑے اور جوتے ان کی حالتِ زار کھول کھول کر بیان کر رہے ہیں اور وہ اس انتظار میں کھڑے ہیں کہ کوئی آئے اور انہیں آج کے دن کے لیے روزگار مل سکے لیکن صبح سے شام ہو جاتی ہے اور وہ بے جان قدموں سے گھروں کو واپس لوٹ جاتے ہیں۔

اُمیدیں اور سگریٹ ختم ہو جائیں

تو سب بے جان ہاتھوں سے

شِکن اندر شِکن لپٹی گزشتہ شام کھاتے ہیں

اور آنکھوں میں یہ دُکھ لے کر

گھروں کو لوٹ جاتے ہیں

کہ اُن کا کوئی آقا

نویدِ بندگی لے کر نہیں آیا

(برفاب ص ۴۱)

یعنی بھوک اور افلاس آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ انسان جو پیدا تو آزاد ہوا تھا آج وہ مختلف پنجروں کا قیدی ہے اور یہ بھوک انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے جو اس کی سبھی صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے۔ ہمارا معاشرہ اس حد تک کھوکھلا اور بے جان ہو گیا ہے کہ آج ایک زندہ انسان ایک مردہ انسان کو اپنے دکھ درد بتاتے ہوئے اس سے لباس مانگ رہا ہے۔ نظم کفن چور کا ایک بند درج ذیل ہے۔

پردۂ خاک میں لپٹے ہوئے بے جان وجود!

باعثِ ننگِ زمیں ہوں، مگر اک بات بتا

جسم مٹی ہو تو کپڑوں کی ضرورت کیا ہے

دیکھ پیوندِ زمیں! میرے تن عریاں پر

داغ افلاس کا پیوند۔۔۔ اجازت دے دے

مر کے مرتے ہوئے انسان کو زندہ کر دے

ایک ملبوس کمانے کی اجازت دے دے

ورنہ بھوکی ہے بہت خاک، کہاں دیکھے گی

جسم کھا جائے گی، پوشاک کہاں دیکھے گی

(گرہ کھلنے تک ص ۲۳)

شہزاد کی یہ نظم آج کے انسان کی بے بسی اور مجبوری کا ایک اقرار اور جرم نامہ ہے۔ یہ طبقاتی کشمکش، یہ افلاس اور بھوک کی کہانیاں اور انسان کی بے بسی کی داستانیں صرف اس ملک یا علاقے کی کہانیاں نہیں بلکہ یہ تو پورے عالم کی داستان ہے۔ زر اور مفلسی کی یہ تلوار سب پر اسی طرح وار کر رہی ہے۔ صرف چہرے مختلف ہیں سبھی کے دکھ درد ایک جیسے ہی ہیں۔ نظم "ویلیٹائن ڈے" میں لکھتے ہیں۔

تیسرے درجے کی دنیا ہو کہ پہلی دنیا

زر کی تلوار وہی

مفلسی ایک طرح وار کیا کرتی ہے

(گرہ کھلنے تک ص ۴۰)

اس دنیا میں طرح طرح کے مناظر ہیں کچھ کہ لیے یہ دنیا تفریح گاہ ہے تو کچھ کے لیے آزمائش کی جگہ، کچھ سرمست قہقہے لگا رہے ہیں تو کچھ دنیا کے مصائب سے تنگ آنسو بہا رہے ہیں۔ نظم "مری کے مال روڈ پر" میں دونوں طرح کی صورتحال کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے کہ گرمیوں کی شدت سے پریشان کچھ لوگوں نے سیر کے لیے پہاڑوں کا رُخ کیا ہے مری کے مال روڈ پر خوش لباس اور سرمست لوگوں کا ہجوم ہے اور محض دل بہلانے کے سامان کر رہے ہیں اور جنہوں نے بزمِ عیش سجا رکھے ہیں وہاں حقیقت کا دوسرا رخ کچھ اس طرح ہے کہ ایک نو سال کا بچہ وہیں اس سڑک پر کاغذ کے پرزے اکھٹے کر رہا ہے۔ نظم کے آخر میں شہزاد کاتبِ تقدیر کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ

درِ نصیب توڑ دو

نئے سرے سے بانٹ دو

(برفاب ص ۱۰۸)

یہ معاشرہ جہاں طبقاتی کشمکش کے ساتھ ساتھ ذاتی خود غرضی بھی عام ہے اور بے کسوں اور لاچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں ایسے میں شہزاد نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی ہے وہ جہاں بھی معاشرے میں ناہمواری اور عدم توازن

کی فضا دیکھتا ہے تو ان کے لب گویا ہو جاتے ہیں۔ شہزاد کی سوچ کا دھارا مقامی حدوں تک محدود نہیں بلکہ وہ اپنی نظموں میں آفاقی حقائق بھی آشکار کرتے نظر آتے ہیں۔ طاہرہ اقبال (۳۰) لکھتی ہیں:

> "شہزاد نیّر ذات کے گھمسان کارزار کے جدال تک کہیں بھی وقت کی مصلحتوں کو فطرت کی صداقتوں پر حاوی نہیں جانتا۔ وہ احتجاجی حرفوں کی پر گو علامتوں اشارتوں ایمائیتوں میں وہ سب کہہ جاتا ہے جو شاید کہنے کو بھی اک فوجی کا جگر چاہیے۔"

حقیقت نگاری:

شہزاد کی شاعری خوابوں اور خیالوں کی شاعری نہیں بلکہ حقیقی اور زمینی شاعری ہے۔ شہزاد کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جو حقیقت سے نظریں چرانے کی بجائے معاشرے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھتا ہے اور پھر جو کچھ اسے نظر آتا ہے وہ اسے اپنی شاعری میں بیان کر دیتا ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنے کی بجائے ان کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ شہزاد کی شاعری میں ہمیں ہر طرف حقیقت ہی حقیقت نظر آتی ہے۔ آج کا انسان روٹی اور روزی کے چکر میں اپنی فطری خواہشوں اور چاہتوں سے منہ موڑے بیٹھا ہے اور اپنے گھر والوں اور محبتوں سے دور روزی کی تلاش میں سفر کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے۔

کھینچ لے جانے شکم آئے تو کیا چارہ ہے

رزق کانٹے سے لگا چارا ہے

ایک بار اور کڑے کوس بلاتے ہیں مجھے

ایک بار اور کہیں اور مجھے جانا ہے

(بے نیازی نے میرا رزق بکھیرا ہے جہاں)

چاک سے اترے وجود ص ۱۵۵

قریشی(۲۹)لکھتے ہیں

"اس کی نظمیں ادراکی کاملیت، فکری بالیدگی اور خیال انگیز اسلوب سے مملو ہو کر معاصر ادبی منظر نامے پر گہرا تاثر لیے ہوئے ہیں۔اس نے اپنی نظموں میں تہذیبی رچاؤ معاشرتی کج رویوں اور سماجی ناہمواریوں کو موضوع سخن بنا کر پوری بے باکی سے نہ صرف ہمیں اخلاقی برہنگی کا احساس دلایا ہے بلکہ نشتر چبھونے کے اس عمل میں اس نے منٹو کا سا طرزِ عمل اپنایا ہے کہ بغیر کلوروفل سنگھانے سے جراحی کا یہ عمل جس سے مریض چیختا اور چلاتا ہے واقعتاً ہماری ضرورت ہے تاکہ وہ درد کا مداوا مانگنے کی بجائے درد کی وجہ پر غور کرے۔"

شہزاد کا تصور سچ بھی نہایت واضح اور زمینی حقائق کے مطابق ہے اور یہ سچ عہد رفتہ کی دین ہے کہ زندگی کی ہماہمی میں جتنی جگمگاہٹیں ہیں، اتنی ہی جبر کی صورتیں بھی ہیں۔ نامعلوم مقاصد کے لیے جاری یہ جنگیں نہ جانے کب تک جاری رہے گی اور ان کے کچھ نتائج بھی ہوں گے یا یونہی بے نتیجہ رہیں گی ایسے میں شہزاد کا تعلق اس قبیلے سے ہے جو ان دھول زدہ رستوں کی مسافرت میں بھی صداقتوں کے قافلے کے امین ہیں اور جو کامل یقین کو اپنا ساتھی بنائے ہوئے ہیں۔ شہزاد کا تصورِ محبت بھی ماورائی نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت ہے۔ آج کے نام نہاد عاشق جو من کی بات کرتے ہیں اور ان کی اندر جسموں کی بھوک لیے بے چین ہیں ان پر طنز کرتے ہوئے شہزاد اپنی نظم "بدن کی حمایت میں" میں لکھتے ہیں۔

بہت ہو چکی تن کی نندا

بہت لوگ کرتے رہے ہیں بدن کی مذمّت

مری گل بدن!

آج تیرے لبوں سے بدن کا قصیدہ جو چُھوٹا

مشیّت کے ٹانکے اُدھڑنے

تانیثیت:

عورت اس معاشرے اور زندگی کا ایک اہم حوالہ ہے اس حوالے سے شاعری میں بھی عورت کی زندگی اور اس کے مسائل کا بیان لازم و ملزوم حیثیت کا حامل ہے۔ شاعر معاشرے کا ایک ایسا فرد ہوتا ہے جس کا شعور اور وجدان معاشرے کے دیگر افراد کی نسبت زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں عورت کو ہمیشہ سے ہی محکوم سمجھا جاتا رہا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اس کے حقوق سلب کرنے کی کوشش ہمیشہ معاشرے کی طرف سے جاری رکھی گئی ہے۔ شہزاد اپنی شاعری میں حقوقِ نسواں کی بات کرتے ہیں وہ عورت کے ان دکھوں کی بات کرتے ہیں جو ازل سے ان کی قسمت میں لکھ دیے گئے ہیں وہ مسائل جو عورت کو صدیوں پہلے درپیش تھے آج بھی وہ کسی نہ کسی صورت میں ان سے نبرد آزما ہو رہی ہے۔ آج کی عورت جس نے شعور اور آزادی کے لیے تعلیم حاصل کی تھی آج گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ معاشی ضرورتوں کے لیے بھی لڑ رہی ہے۔ نظم ورکنگ وومن میں لکھتے ہیں:

دو نازک سے کندھوں پر تم

کتنا بوجھ اُٹھاتی ہو

گھر کی چھت کا

کمر توڑ مہنگائی، بھاری ٹیکسوں کا

دفتر کی ذمہ داری کا

تیز کسیلی باتوں، میلی نظروں کا

(گرہ کھلنے تک ص ۲۹)

ایک طرف ایسی گھریلو عورتیں ہیں جو ان مردوں کے تسلط اور جبر کا شکار ہیں تو دوسری طرف ایسی عورتیں ہیں کہ مردوں نے روپے اور پیسے کے زور سے ان کے جسم خرید رکھے ہیں۔ یہ دونوں جبر کی دو مختلف صورتیں ہیں جن کا شکار عورت ہے۔ ان عورتیں کی ذہنی اور جسمانی تھکن کو ہم نظم "تین اور تین سو" میں پڑھ سکتے ہیں۔ یہ نظم

جذبات نگاری کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔ ایک طرف وہ تین محوِ رقص عورتیں ہیں جن کو دیکھنے کے لیے تین سو مرد بے چین و بے قرار ہیں اوراور ان کی بیویاں ان کے انتظار اور ہجر میں تنہائی کا شکار ہیں۔ نظم کا آخری بند درج ذیل ہے۔

منتظر عورتیں

رات آنکھوں سے ہو کر گزرتی ہوئی

ہجر بستر پہ پہلو بدلتے ہوئے

کربِ تنہائی سہتی ہوئی عورتیں

تین سو عورتیں!

(گرہ کھلنے تک ص۲۸)

شہزاد اس عہد کی عورت کا نوحہ بھی کہہ رہے ہیں اور اسے اس کے حقوق سے اگاہ بھی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حنا زیب(۳۱) لکھتی ہیں:

> "وہ عموماً حقوق نسواں کی بات کرتے ہیں اور عورت میں جذبہ حرمت بیدار کر رہے ہیں۔ اسے زمانے کے حصاروں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس میں قوتِ ارادی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں اسے اس کے اصل مقام و مرتبے کا ادراک دے رہے ہیں تاکہ وہ باقی ماندہ زندگی عزت، آبرو اور آزادی سے گزار سکے۔ اسے یہ بھی باور کروا رہے ہیں کہ اگر تم نے اپنے مقام کو نہیں پہچانا تو خسارا تمہیں کو ہو گا۔ نقصان بھی تمہیں اٹھانا پڑے گا۔"

شہزاد نظم "حوّا سے" میں عورت سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اپنے ارد گرد روایتوں اور پابندیوں کی چنی ہوئی اس دیوار کو ہٹا دو اور اپنی ذات کو پہچانو۔ نظم کا ایک بند پیشِ نظر ہے۔

اکیلے پن میں بڑی گھٹن ہے

نہ اپنے ہونٹوں پہ قُفل ڈالا

کسی نے تم سے غلط کہا ہے

کہ گھر کا دروازہ ہی تمہاری سمجھ کی حد ہے

یہ در تو مدت سے زنگ آلود میخ سے بند ہو چکا ہے

سماج نے اس پہ ایک زنجیر ڈال دی ہے

رواج، مذہب، انا کی کڑیاں جڑی ہیں

اُٹھو! یہ زنجیر توڑ ڈالو

کہ در کی زنجیر اب تمہارے قدم کی زنجیر بن چکی ہے

رواج، مذہب، انا کے سنگی حصار ڈھا دو

نہیں جو کھلتا تو در گرا دو!

(چاک سے اترے وجود ص ۱۳۱)

سیاسی منظر نامہ؛

ہمارے ملک کا سیاسی نظام جھوٹ کا پلندہ ہے۔ سیاسی استحکام کی بات کریں کو ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے عہد کا سیاسی منظر نامہ متزلزل اور ناقابلِ بھروسہ ہے۔ آج کے سیاستدان جمہوریت کے نام پر بھی عوام کو بیوقوف بناتے ہوئے ان کا استحصال کر رہے ہیں۔ سیاستدانوں اور ان کے کھوکھلے نعروں نے آج لوگوں کو بنیادی ضروریات تک سے محروم کر دیا ہے۔ ایک شاعر اپنی عہد کی سماجی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سیاسی منظر نامے پر بھی لکھتا ہے۔ شہزاد نے اپنے عہد کے سیاسی حالات پر بہت کچھ لکھا ہے اور وہ ملکی دائرے سے باہر نکل کے بین الاقوامی سطح پر جاری اس ظلم و ستم کی حکایت بیان کرتے ہیں۔ نظم "سامراج" میں لکھتے ہیں:

کس کے الفاظ رُعونت کے فلک سے اُترے

جیسے تقدیر گزیدوں پہ نوشتے اُترے

کس نے آنکھوں میں پروئی ہیں پرائی درزیں

میرے آنگن میں نگاہوں سے پھرا کرتا ہے

چھپ کے افلاک میں دنیا کو تکا کرتا ہے

فیصلے بھیجتا رہتا ہے زمانے کے لیے

اور ہتھیار نکلتے ہیں منانے کے لیے

میری تہذیب کا ہر نقش بدل دیتا ہے

اپنے نقشے کی لکیروں سے ملانے کے لیے!

(گِرہ کھلنے تک ص ۶۳)

سیاستدانوں اور دنیا کے ان عارضی ٹھیکیداروں نے لوگوں کی زندگیوں کو مذاق بنا رکھا ہے اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہوئے ہیں۔ سپر پاور جو کہ تمام ملکوں پر حکومت کر رہا ہے اور سب کو اپنے حکم کے مطابق چلانا چاہتا ہے وہ دوسرے ملکوں کو اپنے نقشے میں ملانے کے لیے ان کے ذاتی تشخص اور تہذیب و ثقافت کو ختم کر رہا ہے۔ "ہدایت کار" شہزاد کی نمائندہ اور بہترین نظم ہے اس میں انہوں نے "ہدایتکار" کی علامت سپر پاور کے لیے استعمال کی ہے اور اس علامتی پیرائے میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا ہے جو کہنا کسی مرد آہن کا کام ہے۔ نظم کا آغاز کچھ اس طرح ہے۔

نہیں یہ زاویہ اچھا نہیں

آؤ اِدھر سے روشنی ڈالو

وہی منظر اُجاگر ہو جو میں نے سوچ رکھا ہے

(گِرہ کھلنے تک ص ۱۳)

ظاہری صورت میں ہدایت کار کچھ ہدایات دیتا نظر آرہا ہے مگر یہ ہدایت کار استعارہ ہے جبر کا اور ہر منظر اور جسم پر اپنی مرضی چلانے والے ڈکٹیٹر کا جو چاہتا ہے کہ صرف وہی منظر ابھارے جائیں جن کی اجازت وہ دے اور جو اس کے فائدے میں بہتر ہوں۔ نظم کا اگلا حصہ کچھ اس طرح ہے۔

کہانی کو کدھر سے موڑ دینا ہے

پرانی داستاں اندر یہ منظر کس جگہ جوڑ دینا ہے

یہ سب کچھ جانتا ہوں میں

تمہارا کیا؟ ذرا سے بیچ کے کردار ہو تم سب

تو بس اپنی غرض رکھّو

کہاں آغاز تھا انجام کب ہو گا

تمہیں پوری کہانی سے کوئی مطلب؟

تمہیں تو جلد ہی میں مار ڈالوں گا

کہانی کار بھی میں ہوں

(گِرہ کھلنے تک ص ۱۴)

سائنسی مضامین:

ادب خاص طور پر شاعری میں سائنسی مضامین کا استعمال ایک انوکھا اور دشوار امر ہے کیونکہ ہمارے ہاں عام طور پر سائنس کو ادب سے بالکل الگ چیز سمجھا جاتا ہے۔ایسے میں بناہچکچائے شاعری میں سائنس مضامین کو لے کر انااور انہیں کمال خوبی سے نبھانا بھی شہزاد کا ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ شہزاد نے اپنی شاعری میں سائنسی مضامین کو بھی اس کامیابی سے برتا ہے کہ سائنس کو رومانس بناڈالا ہے۔ یہ سائنسی اصطلاحات اور مضامین بھی ان کے کلام کو بوجھل نہیں ہونے دیتے بلکہ ان کا حسن تخیل اور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ برفاب میں شہزاد کی ایک نظم surrogation کے عنوان سے ہے جس میں انہوں نے ٹیسٹ ٹیوب اور سروگیشن کے عمل سے ایک بانجھ عورت کے ماں بننے کے عمل کو دکھایا ہے اور اس عورت کے جذبات کی نمائندگی کرنے کی کوشش کی ہے۔اس نظم میں شہزاد نے قطعی غیر رومانوی موضوع کو ادب کا حصہ بنایا ہے۔شہزاد کی یہ نظم ایک امید اور رجائیت کا پہلو لیے ہوئے ہے جس میں سائنس کی مدد سے ایک بانجھ عورت ماں بننے کے سکھ سے آشناہوتی ہے۔

جستجو کا سفر

بانجھ خواہش کے پَھلنے کی منزل پہ ہے

خواہشوں سے بہت ہی زیادہ تھے

بیضے جو بے کار بہتے رہے

ایک سرسبز بیضہ کسی کا

ترے خانۂ مامُرادی میں پیوند کر دیں گے

جو باور دہو کے

تیرے بدن سے بدن کو کشیدے گا

تیری طرف ہاتھ پھیلائے گا

تیرا کہلائے گا

(برفاب ص۵۵)

شہزاد کی ایک اور نظم "ہائبر نیشن" اپنے اندر معنی و مفہوم کی کئی گہرائیاں سمیٹے ہوئے ہے اور ایک علامتی نظم ہے جس میں ہائبر نیشن کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ ہائبر نیشن غیر فعالیت کا عمل ہے اور بعض جانوروں مثلاً سانپ، ریکھ، مینڈک اور برفانی ریچھ وغیرہ میں اس کیفیت سے گزرتے ہیں اور سردیوں میں ایک لمبے عرصہ کے لیے زیرِ زمین چلے جاتے ہیں۔ یعنی ناموزوں اور غیر موافق حالات میں آدھی زندگی پر گزارا کرنا ہائبر نیشن ہے۔ شہزاد کی نظر میں آج کا انسان بھی ہائبر نیشن اور غیر فعالیت کے عمل کا شکار ہے اور صدیوں سے بدن کے سیلن زدہ بِل میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو نہیں اندازہ وہ زندہ ہے یا اس کا نیم مردہ تنفس بھی دھوکا ہے۔

میں صدیوں سے تنہا

گھٹن میں گُندھے حَبسِ تاریک میں سانس روکے پڑا ہوں

بِدن کے غلیظ اور سیلن زدہ بِل میں بے حِسّ و حرکت

نَم آلود مٹّی مس لِتھڑا ہُوا ہُوں

نہ جانے میں زندہ ہوں

(برفاب ص۲۶)

یہ نیم مردہ وجود بدن کے تنگ و تاریک مسکن میں صدیوں سے قید ہے اور اس کی آنکھیں بھی اب روشن نہیں رہیں یہ ناتواں وجود ہلکی سی امید لیے کسی روزن کی تلاش میں سرگراں ہے یہ منتظر ہے کہ سورج کی کوئی کرنیں آئیں اور اس کی پسلی میں اُتر کر اسے کھڑے ہونے کی نوید دیں۔ لیکن یہ بل کے باہر کے مناظر دیکھ کر پھر ڈر جاتا ہے اور اس کا سورج ابھی جہاں کے اُفق پر نمودار ہونا ہے۔

نہیں۔۔۔بِل کے باہر کا موسم

ابھی ساز گاری پہ مائل نہیں ہے

ابھی اَیسا سورج جہاں کے اُفُق پر نمُودار ہونا ہے

جو میری پسلی میں

کِرنوں کا نیزہ چبھو کر کہے:

اُٹھ کھڑا ہو!

(برفاب ص ۲۷)

آج کا انسان سچ میں اپنی ذات کا قیدی ہو چکا ہے اور وہ غیر فعالیت کے عمل کا شکار کسی روزن کسی سورج کسی امید کے آجانے کے انتظار میں قید کی سی زندگی گزار رہا ہے۔

وطن سے محبت اور فوجی زندگی کی نمائندگی:

شہزاد کی نظموں میں وطن ایک اہم حوالہ ہے۔ شہزاد ملکی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس وطن کی بقا کو اپنی بقا کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لیے جان قربان کرنے کا عزم و حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ اس وطن کے موسموں کو اپنے دل سے گزر جانے والے موسم سمجھتے ہیں اور اس کے رنج و الم کو اپنے رنج و الم سمجھتے ہیں۔ اس کی حسین وادیوں اور سرسبز و شاداب فصلوں کو اپنے دل پر لہلہاتے محسوس کرتے ہیں۔ شہزاد نے اس وطن عزیز کے کئی علاقوں اور وہاں پر بستے لوگوں اور مناظر کو اپنی نظموں میں اُتار دیا ہے۔ نظم "ہچکولے کھاتے خواب" میں بلوچستان کی ایک بارات کے آنے کا منظر بیان کیا ہے۔ بلوچستان کو کہ ترقی اور وسائل میں دوسرے علاقوں سے بہت پیچھے ہے اور وہاں کے لوگوں کا طرزِ زندگی کافی حد تک پسماندہ ہے۔ وہاں کے یہ مناظر اور حالات شہزاد کے دل کو بے چین کر دیتے ہیں۔

خوابوں کی اِک گٹھڑی

جس میں سات رنگوں کی لیریں۔۔۔

رنگوں کی بارات میں کھوئے

جُھلسی مٹی، تپتے پتھر

اِک حیرت سے دیکھ رہے تھے

وقت سے پیچھے

اونٹ کے اوپر

خواب سفر بھی سست قدم تھا

(چاک سے اُترے وجود ص ۱۱۳۸)

شہزاد نیر کی نظموں میں مٹی سے محبت اور مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے وہ مردِ سخن کے ساتھ ساتھ اپنی دھرتی کے سپوت اور ایک بہادر فوجی بھی ہیں اور ان کی نظموں میں مٹی سے محبت کے کئی گہرے حوالے موجود ہیں۔ شہزاد اپنی نظموں میں ایک فوجی کی زندگی اور احساسات کی نمائندگی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نظمیں "سیاچن"، "کارگل" اور "شکست کس کی ہے" اس طرزِ فکر کی نمائندگی کرتی نظمیں ہیں۔ سیاچن میں بتایا گیا ہے کہ ایک فوجی جو کہ بہت سے کٹھن راستوں اور منزلوں سے گزرتا ہے وہ یہ سب کچھ اپنے وطن کے لیے برداشت کرتا ہے اور اس کے پیشِ نظر یہ ہی مقصد ہوتا ہے کہ

مِرے یہ نوجواں ساتھی

کہ جن کے عَزم کا پرچم ہُمالہ سے بھی اُونچا ہے

یہ برفانی فضاؤں میں

مخالف سمت سے آتی ہواؤں سے بھی لڑتے ہیں

دِلوں میں یہ ارادہ ہے

وطن کا نام اُونچا ہو

ہمارا مان اُونچا ہو!!

(برفاب ص ۴۵)

آج کے انسان کی بے بسی اور داخلی کرب:

شہزاد کی شاعری میں آج کے انسان کی بے بسی کا واضح اعترافیہ ملتا ہے۔ آج کے دور کی گہما گہمی اور حالات نے انسان کو اندر سے مکمل طور پر کھوکھلا اور بے بس کر دیا ہے اور وہ اندر سے بہت تنہائی کا شکار ہے۔ آج کا انسان فائلوں اور سکرینوں کے پیچھے چھپ کر رہ گئے ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور کے ساتھ چلتے چلتے اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں کہیں گم سی ہو گئی ہیں۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ اور شکست کا شکار ہو گیا ہے۔

دماغ اِک میز پر رکھّا ہے

آنکھیں فائلوں کے ڈھیر میں گُم ہیں

جہاں۔۔۔پوروں میں سمٹے ہیں!

مگر ہم بَٹ رہے ہیں

(برفاب ص ۲۲)

آج کا انسان بے بسی اور لاچاری کا استعارہ ہے جس کو حالات نے بہت سے پنجروں اور بیڑیوں میں قید کر لیا ہے وہ ایک طرف دنیا اور کاروباری امور میں الجھ کر خود سے دور ہو گیا ہے تو دوسری طرف دین کے نام پر بھی اس کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ وہ چاروں جانب سے شکست کھا رہا ہے۔

مِرے ہاتھوں کو

قِسمت کی کڑی رسّی نے جکڑا ہے

وُجُودی، لاوُجُودی بیڑیوں کو پاؤں میں ڈالے

میں نامعلوم ساعَت کے سفر پر ہُوں

مگر مجھ کو زمیں افلاک کے پنجرے نے

شش جانب سے گھیرا ہے!

(برفاب ص۲۹)

عہدِ جدید کی مصروف ترین زندگی کا نوحہ، ذہنی و جذباتی کشمکش، انسان کی بے وقعتی، اور ماضی سے محرومی کا واضح احساس ہمیں شہزاد کی نظموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ شہزاد کی اور بھی بہت سی نظمیں انسان کے داخلی کرب اور دکھ کا واضح اعترافیہ ہیں جن میں "وہی بے چارگی ہے"، "ہم فراموش ہیں" "منجمد خواب"، "اداسی"، "اندر کی جنگ"، "میں نے مجھ سے کہا"، "عذاب آنکھیں" وغیرہ ہیں۔ شہزاد کی شاعری حقیقی زندگی کا ایک تلخ منظر نامہ پیش کرتی نظر آتی ہے اور معاشرے میں فرد کے داخلی تضادات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ملیحہ سیّد (۳۲) لکھتی ہیں:

> "شہزاد نیّر کی نظموں نے تو گزشتہ کئی برسوں سے شعری اُفق پر سکّہ جمار کھا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ جب نظم لکھنے کے لیے قلم تھامتا ہے تو فکشن کی دیوی اس پر پوری طرح مہربان ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی انگلی تھامے منطق و شعور کی حدود سے باہر کی دنیا کی یاترا کو نکل پڑتا ہے۔ پھر اس کرب میں ڈوب کر نظم تخلیق کرتا ہے۔ وہ ایک نظم نہیں رہتی بلکہ ایک نئی دنیا بن جاتی ہے۔ شہزاد نیّر لفظوں کا وہ کیمیا گر ہے جو نظم میں پوری جزئیات کے ساتھ ایک نئی دنیا تشکیل کرتا ہے۔"

تشکیکی فکر:

شہزاد کی شاعری کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی تشکیکی فکر بھی ہے۔ تشکیک در حقیقت کسی مسئلے پر حتمی فیصلہ کرنے سے قبل اس کے امکانات اور نتائج پر بعد از تحقیق یقین کرنے کے ہیں۔ شہزاد کا فکر و فلسفہ ان کو ان بات

کی طرف راغب کرتا ہے کہ وہ بنا سوچے سمجھے کسی بات کی یا چیز کی حقیقت کو تسلیم نا کر لیں بلکہ اس مظہر کو جانچنے اور پرکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں جو اپنے ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ شہزاس کی تشکیک کافی حد تک مثبت اور ان کے علم کی دین ہے جو کہ ان سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کی رسائی اعلیٰ ترین حقیقت تک ہو جائے اور انہیں خطا کے امکان اور شائبے سے مکمل طور پر نجات مل جائے۔ تشکیک ان کی نظر میں حقیقت کی جستجو اور خطا کے امکان کو کم سے کم کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ شہزاد کی تشکیکی فکر انہیں ایک طرف روایت سے انحراف پر آمادہ کرتی ہے تو دوسری طرف ان کا تجسس انہیں خدا سے سوال کرنے پر اکساتا ہے۔

ترے روبرو لب کُشائی روایت کا حصّہ نہیں

حکمِ لب پستگی تجھ سے منقول تھا

سو، مری پُستکوں میں

مناہی شدہ منطقوں کا کہیں کوئی قصّہ نہیں

یہ عجب منطقے ہیں کہ ان پر

کوئی حرف رکھنے لگیں تو سخن ڈولتا ہے

قلم کا قدم راستہ چھوڑتا ہے

مگر کب تلک حرف زنجیر ہوتے

سو آجا! روایت، درایت کے سنگم پہ آ

دیکھ مجھ کو، میں چپ بھی رہوں تو

تجسّس مرا بے دھڑک بولتا ہے

(گرہ کھلنے تک ص ۱۸)

شہزاد کی شاعری میں موجود تشکیک پر روشنی ڈالتے ہوئے طریر (۳۳) لکھتے ہیں:

"شہزاد نیّر کو میں فکر اساس شاعر سمجھتا ہوں۔ یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ "فکر اساس" شاعری کو "تجربہ اساس" شاعری سے مختلف اور الگ تصور کرنا چاہئے۔ کیونکہ فکر اساس شاعری تجربے کو اپنی کسوٹی پر پرکھے بغیر تخلیقی عمل کے سپرد نہیں کرتی۔ فکر اساس شاعری جلوہ منا کثرت میں کسی پنہاں وحدت کا سراغ ضرور دے جاتی ہے جس تک رسائی کے بعد مفرد تخلیقات کے مختلف رنگ منکّے ایک تار میں پروئے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ شہزاد نیّر کی شاعری میں جلوہ نما کثرت مجھے ہمیشہ کسی پنہاں وحدت کی جانب متوجہ کرتی رہی ہے۔ اس پنہاں وحدت کو اب تک اگر میں کسی ایک لفظ میں سموسکا ہوں تو وہ لفظ "تشکیک" ہے۔ وہ اپنے اردگرد موجود تعینات، تعقلات، توہمات اور اعتقادات کو اپنی تشکیکی فکر کی میزان پر پرکھتا رہتا ہے اور یہی تشکیک اس کا تخلیقی محرک بنتی ہے۔ مجھے اس کی نظموں کے مختلف رنگ منکے اسی تار میں پروئے لگتے ہیں۔"

شہزاد جس ادارے میں ملازم ہے ذہنی اور جسمانی طور پر اس کے مکمل وفادار ہے اور اس کی خدمت کا بلند حوصلہ اپنے دل میں رکھتے ہیں مگر وہ انسانوں کو اس خون خرابے کو زیادہ اچھا نہیں سمجھتے اور جب وہ ایک ہی ملک کے لوگوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے ہیں تو وہ تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں کہ جو سامنے کھڑے ہیں وہ دوست ہیں یا دشمن۔ ان کی نظمیں "خودکش"، "وزیرستان" اور "اندر کی جنگ" اسی تشکیک کی ترجمان نظمیں ہیں جو کہ شعبے کے حوالے سے ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ "خودکش" شہزاد کی ایک خوبصورت نظم ہے جو کہ اپنے سماجی پس منظر میں واقع ایک اہم موضوع دہشت گردی کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ جبکہ نظم "وزیرستان" میں قبائلی علاقہ جات میں جاری قتل وغارت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ جہاں توہمات کا شکار ہو کر اپنے اپنوں سے کے خون کے پیاسے ہوئے بیٹھے ہیں۔

کہاں سے آگے حدِ عَدو ہے

کہاں پہ لشکر کی پہلی صف ہے

کہاں ہدف ہے

کسی پہ کھلتا نہیں کچھ بھی

(گرہ کھلنے تک ص ۴۵)

رومانوی جذبات:

شہزاد کی غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی رومانوی جذبات کی بہترین عکاسی ملتی ہے اور انہوں نے محبت کے لطیف جذبات پر مشتمل نظمیں بھی لکھی ہیں۔ روٹھنا، منانا، وفا، بے وفائی، قرب و دوری اور وصل و جدائی جیسی کیفیات بھی ان کی شاعری میں ملتی ہیں۔ محبت شہزاد کے نزدیک کوئی کھیل نہیں بلکہ زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور حقیقت ہے۔ شہزاد اپنی نظموں میں محبت کے ایک بے لوث مبلغ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ آثم کھیازئی (۳۴) لکھتے ہیں:

> "محبت ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے اور محبت کے مسلک سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کا کامل یقین ہے کہ محبت تا ابد موجود رہے گی۔ اسی طرح محبت کے مبلغ اور محبت کے مذہب کے پیروکار بھی کسی نہ کسی حوالے سے ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔ ایسی ہی ایک شخصیت شہزاد نیّر کی ہے جو محبتوں کا امین اور چاہتوں کا بھرپور داعی ہے اسی طرح وہ سچائی کے سفر اور امین کا علمبردار بھی ہیں کیونکہ ایک بڑے شاعر کے لئے اس کی عظمت یہ ہے کہ وہ الفاظ و استعارات کے بحر بیکراں میں غوطہ زنہ ہو کر اپنی انفرادیت برقرار رکھے۔ بلکہ نہ صرف یہ کے اپنی انفرادیت اور علمی پہچان برقرار رکھے دوسروں کے لئے اپنی ذات کو کامیابی اور کامرانی کی علامت بھی بنائے۔"

صدائے منجمند،، رستہ سہل نہیں ہے، کانچ کا پھول، درس اوّل، محبت اور دکھ، میٹھا جھوٹ، حسنِ ناراض کو مشورہ رومانوی مزاج کی حامل نظمیں ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ وہ بھی گوشت پوست کے آدمی ہیں اور معاشرے کی تمام سفاکیوں کے باوجود وہ حسن و جمال اور محبت کے جذبات سے دور نہیں ہوئے۔ نظم "درسِ اوّل" میں لکھتے ہیں:

محبت، وظیفہ ہے۔

ایسا فریضہ ہے جو کارِ دنیا بُھلا کر نبھانا ہے

یہ جنگلوں کی بھٹکتی ہوئی آگ کا کوئی شعلہ نہیں

من پہ کِن مِن سی گِرتی ہوئی

نرم کومل پھواروں کی رِم جھم میں

اندر تلک بھیگنا ہے!

(چاک سے اُترے وجود ص ۱۱۲)

ان تمام موضوعات اور فکری پہلوؤں کے ساتھ ساتھ شہزاد نے اور بھی کئی موضوعات کو اپنی شاعری میں برتا ہے انہوں نے اپنی نظموں میں ٹیکنالوجی کے مضر اثرات اور انسان کی نفسیات کے کئی پوشیدہ پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ شہزاد کی نظم میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے اور انہوں نے ہر نوع کی نظمیات تخلیق کی ہیں۔ان کی نظموں میں نادر کاری کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ شہزاد کی نظم تمام فکری انفرادیت رکھنے کے ساتھ ساتھ فنی پہلوؤں سے بھی تمام خوبیوں سے لبریز ہے۔ان کی نظم کے مطالعے کے دوران کہیں بھی دلچسپی کا دامن میلا نہیں ہوتا بلکہ ان کی شاعری تقاضا کرتی ہے کہ اس کی پیچ در پیچ گرہیں کھولنے کے لیے ان کے الفاظ کی گہرائی میں اُتر کر سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ آج کے اس جھوٹ سے پُر معاشرے میں سچائی کا علم بلند کیے ہوئے اپنے سخن کے سہارے آگر بڑھتے جارہے ہیں۔ان کی نظم تکمیلت کا احساس دلاتے ہوئے مکمل طور پر کامیاب ٹھہری ہے۔ علم سے گہری وابستگی اور فکر و فن سے لگاؤ جیسی خوبیاں ان کے شعری مرتبہ میں اضافہ کرتے ہوئے انہیں ہمہ وقت اگے بڑھنے اور کبھی نارُکنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔

شہزاد کی نظم نگاری کا فنی جائزہ:

شہزاد آزاد نظم کے شاعر ہیں۔ آزاد نظم کی کوئی متعین شدہ ہئیت نہیں ہوتی اور اس کے آہنگ میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ اس کا آہنگ تخیل اور جذبے کے اُتار چڑھاؤ سے تشکیل پاتا ہے۔ نظم آزاد کے تمام مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اور باہم پیوست ہوتے ہیں۔ اس میں نا صرف مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں بلکہ مختلف بحروں کے امتزاج اور ملاپ سے بھی تعمیر ہوتے ہیں لیکن کسی ایک مخصوص بحر کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ بحر کا استعمال آزادانہ ہوتا ہے اور مصرعوں کے اراکان کی ترتیب طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ خیال اور جذبے کے بہاؤ کے تحت مصرعوں کے ارکان گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں۔ آزاد نظم میں قافیہ ردیف کی بھی کوئی پابندی نہیں ہوتی لیکن آزاد نظم میں بھی اِن ہی وسائل شعری کا استعمال واہتمام کیا جاتا ہے جن کا غزل یا علامت شاعری میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ تشبیہ استعارہ، تمثیل اور علامت وغیرہ۔ شہزاد نے اپنی شاعری میں نظم کے فکری عناصر کے ساتھ ساتھ فنی پہلوؤں پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اوران کی نظموں میں تکنیک اور ہیئت کے نِت نئے تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ذیل میں شہزاد کی نظم کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔

بندشِ تراکیب:

شہزاد کی شاعری میں نئی لفظیات اور ترکیب سازی کی متنوع اقسام ملتی ہیں۔ شہزاد نے ترکیبِ سازی میں نہایت کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے اور نہایت عمدہ اور دلکش مرقعے اپنی شاعری میں پیش کیے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے نئی نئی تراکیب وضع کی ہیں جو جدّت سے مالامال ہیں۔ اپنی تراکیب بنا کر ان کا نہایت مناسب جگہ پر استعمال شہزاد کے اعلیٰ فن کی دلیل ہے۔

نظم "جس تن لاگے" سے نئی تراکیب پر مشتمل چند نمونے درج ذیل ہیں۔

بدن اَپنے ہی ملبے کے رگ وریشے میں دَب کر
دست وبازُو، ساق وپا مفلوج کر بیٹھے
تو رسمِ جنبشِ ہستی نبھانے کو

فقط آنکھیں ہی بچتی ہیں

(برفاب ص۷۳)

موزوں قوافی:

اگرچہ آزاد نظم میں قافیہ ردیف کا اہتمام لازمی نہیں لیکن اس کے استعمال پر کوئی قدغن بھی عائد نہیں ہے۔شاعری میں قافیہ کے استعمال سے کلام کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس سے کلام میں موسیقیت اور ترنّم پیدا ہو جاتا ہے۔شہزاد نے اپنی کچھ نظموں میں قافیے کی پابندی کا بھی اہتمام کیا ہے اور اپنے کلام کو موزوں قوافی سے مزّین کیا ہے۔چند مثالیں درج ذیل ہیں:

دوریاں اُنگلیوں پر لپٹتی رہیں
ایک پردے پہ دنیا سمٹتی رہی

(برفاب ص۸۸)

اَن ٹُٹ بندھن ٹوٹ گئے
سب یار پُرانے چھوٹ گئے
گھر دروازے کٹے پڑے تھے
آنگن باڑے بٹے پڑے تھے

(برفاب ص۷۸)

تصویر کاری:

شہزاد کی شاعری میں ہمیں امیجری اور منظر نگاری کی فراوانی دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ دلکش اور عمدہ تصویروں سے اپنی شاعری کو سجاتے ہیں اور یہ تمام تصویریں اور مناظر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں میں ٹھہر جاتے ہیں۔

منظر نگاری کی عمدہ مثال ان کی نظم "ٹوٹی ہوئی چوڑیاں" میں ملتی ہے۔

چٹانوں پہ سورج کا سونا جب اُترے
پہاڑی پرندوں کی داڑی سرد، شفّاف چشموں سے منکے اُٹھائے قطاریں چلیں
اور کتابیں اُٹھائے، ٹھٹھرتے ہوئے ننھے منے بدن
منجمند آب پر پاؤں دھرنے لگیں
تو مجھے یاد کرنا

(گِرہ کھلنے تک ص ۵۱)

شہزاد کی بیان کردہ تمثالیں وحدانی اور منفرد ہیں اور وہ خیال کی کسی ایک پرت کو ایک ہی امیج کے ذریعے بیان کر دینے کے فن کے ماہر ہیں اس کے علاوہ ان کی تمثالیں ساکن نہیں بلکہ متحرک اور زندہ ہیں اور تمثالوں کی حرکت ہلکے ہلکے سرکاؤ سے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے۔

مجھے یاد رکھنا!
کبھی جب چناروں کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی برف
رستوں پہ گرنے لگے
پاؤں پڑنے لگے
پیر پنجال پر بادلوں کی نظر ہو
چکوٹھی، چناری پہ بوندیں پڑیں
اور جہلم سے نیلم دو آبے پہ ملنے کو آئے
تو پھر یاد کرنا

(گِرہ کھلنے تک ص ۵۱)

حسنِ تشبیہ:

تشبیہ کے لغوی معنی مشابہت دینا کے ہیں یعنی علم بیان کی رُو سے جسی چیز کو اس کی خاص خوبی کی بنیاد پر دوسری چیز جیسا قرار دینا تشبیہ ہے۔ شعر کی خوبصورتی کا اظہار عام طور پر تشبیہ کی نزاکت و لطافت پر ہوتا ہے۔ ایک شاعر چیزوں کو اپنے تخیل اور وسیع تر مشاہدے سے دیکھتا ہے۔ غزل کے علاوہ نظم میں بھی تشبیہ کا استعمال کلام کی خوبصورتی اور رمز و ایماء کے لیے کیا جاتا ہے۔ شہزاد کی نظموں میں بہت ہی نادر تشبیہات ملتی ہیں جن سے ان کی بلند خیالی اور فنی دسترس تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

جہاں موسم، مزاجِ یار کی صُورت
گھڑی پل میں بدلتا ہے
عَدُو کے تنگ سینے کی طرح یہ تنگ رستے ہَیں
(برفاب ص ۴۳)

یہاں پر راستے کی دشواریوں اور مشکلات کو عدو یعنی دشمن کے تنگ سینے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نظم "کانچ کے پھول" میں ساعتوں کو گھنے جنگلوں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہاتھ آجائے قوس و قزح
اور کومل سُروں کا مہکتا ہوا دامنِ ہفت رنگ
اُجلے لمحوں کی اُمید کی اِک کرن
ساعتوں کے گھنے جنگلوں کی
حسیں تتلیوں کے پُروں سے
چُرائے ہوئے چند لمحے
جو جیون کے خاکے کو تصویر کر دیں
(چاک سے اُترے وجود ص ۱۰۹)

شہزاد نے اپنے کلام میں جگہ جگہ تشبیہ کے جادو بکھیرے ہیں۔

استعارہ:

تشبیہ کے ساتھ ساتھ استعارہ بھی علمِ بیان کی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں ادھار لینا۔یعنی لفظ کو حقیقی کی بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کیا جائے کہ حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق موجود ہو۔شہزاد کی شاعری میں موجود استعارے بھی منفرد ہیں۔انہوں نے اپنی نظموں میں جابجا برف کے استعارے کا استعمال کیا ہے۔شہزاد نے برف کو ایک وسیع تناظر کی بے کیفی،اذیت،یکسانیت،جبر اور جمود کے استعارے کے طور پر لیا ہے۔برف اُن کے نزدیک بے تحرک زندگی کا استعارہ ہے۔موجودہ دور کی تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی اور اس کے منظر نامے انسان کو ایک اَن دیکھے جمود کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ نظم "منجمند خواب" میں لکھتے ہیں۔

سرد مہری کے گالے

اُداسی کی یخ بستگی کے تلے

دلِ زمیں پر جمی سَرد حرفوں کی تہ

اور موٹی ہوئی

خواب ٹھٹھرنے،لرزنے لگے

خواب پتھر ہوئے

(برفاب ص۴۵)

نظم "نوحہ گر" میں سرخ برسات کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دشتِ تاریخ کی سرخ برسات میں

میں نے خوں کی روانی کا نالہ کیا

(گرہ کھلنے تک ص ۱۳۵)

غرض کہ شہزاد اپنی نظموں میں تمام تر معنیاتی اوراستعاراتی فضا قائم کرتے ہیں اور اسی فضا میں ہی نظم کو آگے بڑھاتے اوراختتام تک پہنچاتے ہیں۔

مصرعوں کی بناوٹ:

نظم کی بناوٹ میں اس بات کا خصوصی دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کون سا مصرعہ کہاں پر کاٹنا اور کہاں سے دوسرے مصرعے کا آغاز کرنا ہے۔شہزاد اپنی نظموں میں مصرعوں کی بناوٹ اورکانٹ چھانٹ پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ مصرعوں کو کہاں پر کاٹنا ہے اور مصرعے کا آغاز و اختتام کس موڑ پر کرنا ہے اس پر شہزاد اپنی پوری توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔

دل کے عُرفوں میں سوئی صداؤ!

اُٹھو! صُورِ آدم اُٹھاؤ

سرافیل سویا پڑا ہے

تمہی کوئی شورِ قیامت جگاؤ

اُٹھو بے نواؤ!

تمہی اپنی مٹی کی دھڑکن میں دھڑکن ملاؤ

تمہارے بدن پر ہے تعمیر جن کی

صداؤں کی لرزش سے

اُن اُونچے بُرجوں کو مل کر زمیں بوس کر دو

کسی کو نہیں مانتی ہیں

صدائیں کوئی اُونچا نیچا نہیں جانتی ہیں!

(گرہ کھلنے تک ص ۶۲)

شہزاد کی نظم کے مصرعے خوب تراشے ہوئے اور نوک دار ہیں۔

صوتی التزامات:

شہزاد کی نظموں میں صوتی التزامات کا استعمال ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے قافیہ ردیف کی پابندی کے ساتھ آوازوں کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔شہزاد ایک ہی حرف کی مختلف آوازوں کو ایک ہی مصرعے میں بڑی خوبی اور مہارت سے استعمال کرتے ہیں۔جیسا کہ نظم "سُرخ گلابوں کے موسم میں" کے دوسرے مصرعے میں گ کی آواز کا تین دفعہ استعمال کیا ہے۔

؎ترے گلنار گالوں کے گلابی پھول کھلتے ہیں

اسی طرح نظم "گلوبل وارمنگ" کے پہلے مصرعے میں گ کی آواز نظر آئے گی۔

؎گلی میں جو نکلا تو گالوں پہ گرمی کے تھپڑ پڑے

اسی طرح شہزاد نے آوازوں کے استعمال سے نظموں میں دلکشی و رعنائی پیدا کی ہے جو کہ ان کی فنی مہارت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

صنعت گری:

صنعت گری ایک آرٹ ہے جس سے شاعری میں آرائش کا کام لیا جاتا ہے۔شاعر جو کہ لفظوں کا جادوگر ہوتا ہے اپنی شاعری کو دلکش اور رنگین بنانے کے لیے مختلف صنعتوں کا استعمال کرتا ہے تاکہ وہ قاری کو متاثر کر سکے اور اس کی توجہ کا مرکز بن سکے۔اس سے شاعری میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔شہزاد کی نظموں میں بھی مختلف صنعتوں کا استعمال ملتا ہے جیسا کہ صنعتِ تجنیس، صنعتِ تکرار اور صنعتِ تضاد وغیرہ۔

شعر میں دو ایسے الفاظ کا استعمال جو ایک دوسرے کے اُلٹ یا ضد میں ہوں، صنعت تضاد کہلاتا ہے۔ شہزاد کی نظموں میں بھی اس صنعت کا استعمال بڑی خوبی اور مہارت سے کیا گیا ہے۔ مثال نظم "شبِ مے کشی کی سحر" سے درج ذیل ہے۔

تجسّس کو ہم راہ کر کے

تری آنکھ کے اونچے نیچے علاقے میں آیا ہوں

نِکلا ہوں تیری نظر ہم رہ نُما کر کے میں دور تک

میں نے حیرت کو دیکھا

تعجب بھرے لفظ ہونٹوں پہ رکھے

کئی منزلیں چڑھ گیا

نیچے اترا، اترتا گیا

(گِرہ کھلنے تک ص ۹۵)

ان مصرعوں میں اُترنا، چڑھنا، اونچے، نیچے کا تضاد موجود ہے۔ طویل نظم "خاک" میں سے بھی صنعتِ تضاد کا استعمال موجود ہے۔

بے ارادہ مرا جسم اُٹھا

اور اُوپر کو چڑھنے لگا

پاؤں پھسلا تو نیچے گیا

جمتے کانوں میں آواز اُتری،

(برفاب ص ۱۳۹)

مندرجہ بالا اشعار میں دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اُوپر اور نیچے کا تضاد موجود ہے۔اس کے علاوہ نظم "درسِ اوّل" سے ایک بھی ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس کے دونوں مصرعوں میں میں اور تو کا تضاد موجود ہے۔

جہاں "میں" پگھلتا ہے

اور "تو" کے سانچے میں ڈھلتا ہے

(چاک سے اُترے وجود ص ۱۱۲)

تجنیس کے معنی ہیں ایک ہی جنس اور نوع کا ہونا۔جب شعر میں دو ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کا تلفظ ایک ہو لیکن معنی میں مختلف ہوں تو اسے تجنیس تام کہیں گے۔شہزاد نے اپنی شاعری میں اس صنعت کو بھی بخوبی برتا ہے۔نظم "حسنِ ناراض کو مشورہ" سے شعری مثال درج ذیل ہے۔

اب بھلا ڈالو گلے مِل کر گِلے

شکوؤں سے دامن جھاڑ لو

پہلے قدم پر ہی محبت لوٹ آئے گی!

(گرہ کھلنے تک ص ۹۴)

اسی طرح نظم "من و سلویٰ" میں بھی صنعتِ تجنیسِ تام کا استعمال ملتا ہے۔

زمیں لڑکھڑائی

مکانوں کا ملبہ بنا

اور ملبے پہ بڑھتی ہوئی بھوک پھیلی

جو بچّے بچے تھے

وہ بھوکی نگاہوں سے افلاک تکتے ہوئے سو گئے تھے

(چاک سے اُترے وجود ص ۱۲۱)

صنعتِ تکرار ایسی صنعت کو کہتے ہیں جس میں دو لفظ ایک ہی معنی رکھتے ہوں اور مصروں یا اشعار میں ان کو برابر جمع کیا جائے یعنی کسی شعر یا مصرعے میں ایک ہی لفظ کی تکرار کی جائے۔ اس تکرار سے کلام میں زور اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ شہزاد کی نظم "مونالیزا" سے ایک مثال درج ذیل ہے۔

وہ آرزؤں کے پھول جتنے تھے

پتّی پتّی بکھر گئے ہیں

(چاک سے اُترے وجود ص ۱۱۳)

اس کے علاوہ نظم "کوئی پہاڑ ہٹ گیا" سے بھی مزید وضاحت کے لیے ایک شعری مثال پیش کی جاتی ہے۔

جو آگے آگے چل پڑی تو راستہ نکل پڑا

خدا کو پیچھے چھوڑ کر

میں خود کو لے کر چل پڑا!!

(گرہ کھلنے تک ص ۱۱۷)

تکمیلیت:

شہزاد کی نظمیں ادھوری نہیں اور نہ ہی انہیں پڑھ کر کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں چاہے طویل ہوں یا مختصر اپنے موضوع کو پورا بیان کرتی ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں ان کہی چھوڑنے کے قائل نہیں اور نا ہی انہیں ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کی غرض سے نامکمل رکھتے ہوئے بوجھل کر دیتے ہیں بلکہ انہوں نے کوشش کی ہے کہ ان کی نظم تکمیلیت کا احساس دلائے۔ شہزاد کی نظمیں مکمل نظمیں ہیں جو کہ قاری پر حیرت و فکر کے تمام دروازے وا کرتے ہوئے اپنے اختتام تک پہنچتی ہیں۔ نظم "مشینی ارتقا" کا آخری بند مثال کے طور پر درج ذیل ہے۔

فلک کی سمت دیکھوں تو مِری آنکھیں سلگتی ہیں

زمیں کی گود میں لیٹوں۔۔۔

مگر رخسار جلتے ہیں

مرے آگے دُھند لکا ہے

ذرا تم دیکھنا ہم دم!

مشینی ارتقا ہم کو یہ کس منزل پہلے آیا!

(برفاب ص ۱۲۶)

علامتی انداز:

شہزاد کی نظموں کی فضا علامتی اور اشاراتی ہے۔ علامت کے لغوی معنی ہیں نشان یا سراغ اورادبی اصطلاح میں علامت نگاری سے مراد کسی خیال یا فکر کو بالواسطہ طور پر کسی نشان یا اشارے کے طور پر پیش کرنے کا نام ہے۔ علامتیں فنی اورادبی اعتبار سے معنی کی ترسیل کا بہت موثر وسیلہ سمجھی جاتی ہیں اور یہ شاعری کو پہلو دار بنا کر اس میں حسن پیدا کر دیتی ہیں۔جب ایک فنکار محسوس کرتا ہے کہ لفظ اپنا حسن کھو رہا ہے تو وہ اسے ایسی خوبصورتی عطا کرتا ہے کہ وہ لفظ اپنی عمومیت کھو کر خصوصیت اختیار کر لیتا ہے اورایک دلکش اور خوشگوار علامت بن جاتا ہے۔اسی طرح شاعر علامتوں کے ذریعے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتا ہے۔علامت ہی وہ واحد سہارا ہے جس کے ذریعے شاعر اپنی بات مخفی پیرائے میں قاری تک پہنچاتا ہے۔شہزاد اپنی شاعری میں علامتوں کا خوب استعمال کرتے ہیں۔شہزاد منفرد اور جدید علامتوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنی شاعری میں بہت گہری بات کو بھی انتہائی سادگی سے بیان کر دینے کے ماہر ہیں۔ان کے پہلے شعری مجموعہ "برفاب" کی زیادہ تر نظمیں علامتی رنگ لیے ہوئے ہیں جیسا کہ ہائبر نیشن، دائرہ، غائب وغیرہ۔اس کے علاوہ انہوں نے نظم "ہدایت کار" میں ہدایت کار کو

بطور علامت استعمال کیا ہے۔ اس میں ہم ہدایت کار کو کسی فلم کا ہدایت کار بھی سمجھ سکتے ہیں اور یہ اس سماج کے ڈکٹیٹر اور سامراج بھی ہو سکتے ہیں کہ جو پوری دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچاتے ہوئے ان سے خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔

یہ مرنا ہے؟

ارے اس میں ذرا سی جان توڈالو

گذشتہ بھول جاؤسب

وہی دیکھو جو میں آگے دکھاتا ہوں

مری ہر "سین" پر نظریں ہیں

کب کتنا چھپانا ہے

کہاں کتنا دکھانا ہے

کہانی کو کدھر سے موڑ دینا ہے

(گرہ کھلنے تک ص ۱۴)

المختصر یہ کہ شہزاد نے اپنی نظموں کو فکری خوبیوں کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی خوب مزین کیا ہے اور ان میں تشبیہ و استعارہ اور صنعتوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ اندازِ بیاں کے حوالے سے بھی کئی نفسیاتی حربے آزمائے ہیں۔ شہزاد نے موزوں قوافی و ردیف کا استعمال کرتے ہوئے اپنے کلام میں وسعت پیدا کی ہے جو کہ فنی اعتبار سے یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ شہزاد ایک اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ دہلوی'سید احمد(۲۰۱۰)"فرہنگ آصفیہ "جلد اول، طبع عکسی(بار ششم)'لاہور، کوثر پرنٹنگ کارپوریشن، ص۵۷۸

۲۔ جمال، انور(۱۹۹۸)"ادبی اصطلاحات"اسلام آباد، نیشنل بُک فاونڈیشن، ص۱۱۲

۳۔ آغا، وزیر(۱۹۶۸)"تنقید واحتساب"لاہور، جدید ناشران، ص۴۶

۴۔ بریلوی، عبادت(۱۹۸۹)ِ"شاعری کیا ہے؟"لاہور، ادارہ ادب و تنقید، ص۴۳

۵۔ آغا، وزیر(۱۹۹۵)"اردو شاعری کا مزاج"لاہور، جدید ناشران، ص۲۷۲

۶۔ آغا، وزیر(۲۰۱۸ء)" نظم جدید کی کروٹیں، لاہور، سنگت پبلشرز، ص۲۳

۷۔ نقوی، سید طلعت حسین(۱۹۹۰ء)"نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ "فیض آباد، نشاط آفسٹ پریس، ص۳۰۹

۸۔ نقوی، سید طلعت حسین(۱۹۹۱ء)"نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری" دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ص۲۰

۹۔ سرور، آل احمد(س ن)"انتخاب آل احمد سرور"مرتبہ، فقیر احمد فیصل، لاہور، لاہور اکیڈمی، ص۵۹۔۶۰

۱۰۔ اختر، سلیم(۱۹۹۳ء)"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"پندرہواں ایڈیشن، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص۱۷۸

۱۱۔ سروری، عبد القادر(۱۹۳۲ء)"جدید اردو شاعری"حیدر آباد، انجمن ترقی اُردو ہند، ص۱۰۰-۱۰۱

۱۲۔ باقر، آغا محمد(۱۹۳۲ء)"تاریخِ نظم و نثر اردو"لاہور، عالمگیر الیکٹرک پریس ص۱۸۱

۱۳۔ صدیقی، ادریس(۱۹۷۹ء)"اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ"کراچی، سرسید بک کمپنی، ص۵۶۵-۵۶۶

۱۴۔ علیم، شاداب (۲۰۱۰ء) "جدید شاعری کا نقطہ آغاز: اسماعیل میرٹھی" دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ص ۲۲۶

۱۵۔ عبدالحکیم، خلیفہ (جون ۱۹۶۸ء) "فکرِ اقبال" لاہور، بزمِ اقبال، ص ۶۶۳

۱۶۔ نگار، سنبل (۲۰۱۹ء) "اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ" لاہور، فکشن ہاوس، ص ۲۴۸

۱۷۔ جاوید، یونس (۱۹۸۴ء) "حلقۂ اربابِ ذوق" لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۲۸

۱۸۔ آغا، وزیر (۱۹۶۵ء) "اردو شاعری کا مزاج" جدید ناشرین، لاہور ص ۳۷۹-۳۸۰

۱۹۔ نیّر، شہزاد (مصاحبہ) سوالات از حفصہ طاہرہ، ۱۰ جنوری ۲۰۲۱

۲۰۔ ورک، اشفاق (۲۰۱۴ء) "اصناف نظم و نثر" لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ص ۵۷

۲۱۔ نیّر، شہزاد (۲۹ اکتوبر ۲۰۱۹ء) "نعت رسول مقبول ﷺ" مشمولہ "روزنامہ بارڈر لائن" جلد نمبر ۲۲، شمارہ ۲۵۱، چیف ایڈیٹر، نواب ناظم میو، لاہور ص ۴

۲۲۔ نیّر، شہزاد (ستمبر ۲۰۱۹ء) "سلام" مشمولہ 'بابِ دعا' آن لائن میگزین، مدیرہ دعا علی، ص ۱۴

۲۳۔ سلہری، ساحل (جنوری ۲۰۲۱ء) "اردو کی جدید طویل نظمیں" مشمولہ "ماہنامہ ارژنگ" مدیر حسن عباسی، لاہور، راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ص ۲۲

۲۴۔ فتح محمد، خالد (اگست ۲۰۰۵ء تا اپریل ۲۰۰۶ء) "محمد شہزاد نیّر طویل نظم کا تجزیاتی مطالعہ" مشمولہ "ادراک" مدیران، خالد فتح محمد، اسد ملک، گوجرانوالہ، ص ۱۳۵

۲۵۔ ناظر، خوشحال (اپریل تا جون ۲۰۰۸ء) "تبصرہ: برفاب" مشمولہ "مونتاج (سہ ماہی)" مدیرہ منصورہ احمد، لاہور ص ۳۱۳

۲۶۔ جہان، گل (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء) "شہزاد نیّر۔۔۔ نئی نظم کی فکری جہت کا سمت نما" مشمولہ " سہ ماہی فن زاد" مدیر یوسف چوہان، بھیرہ، ص ۱۳۴

۲۷۔ ابراہیم، سعید (۲۰۱۳ء) "یہ نظم "مشمولہ "گرہ کھلنے تک" جہلم، بک کارنر، ص ۱۴۱

۲۸۔ نیّر، شہزاد (انٹرویو) "دی لالٹین The LAALTAIN" ایڈیٹر رب نواز، سرما ۲۰۱۲، لاہور، احسن ذکاء پرنٹرز، ص ۱۰

۲۹۔ قریشی ارشد (جنوری تا مارچ ۲۰۱۰) "کائناتی آدرش اور وجدانی بصیرت کا پرچاک" مشمولہ، شعر و سخن، مانسہرہ مدیر، جان عالم، ص ۲۱

۳۰۔ اقبال، طاہرہ ((جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء) "بیان حلفی (برفاب کا شاعر شہزاد نیّر)" مشمولہ "زر نگار" مدیر علامہ ضیاء حسین ضیاء، فیصل آباد، پیراگون بک فاونڈیشن، ص ۳۰۲

۳۱۔ زیب، حنا (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵) "شہزاد نیر کی شاعری میں سماجی رویوں کی عکس بندی" مشمولہ "ماہنامہ شعر و سخن" مدیر جانِ عالم، مانسہرہ، ص ۴۰

۳۲۔ سیّد، ملیحہ (اپریل ۲۰۲۰ء) "برف کی تہوں میں منجمد خواب" مشمولہ، ماہنامہ بیاض، مدیر عمران منظور، لاہور، ص ۵۶

۳۳۔ طریر، دانیال (۲۰۱۳ء) "نوحہ گر کی تفہیمی جہات" مشمولہ "گرہ کھلنے تک" از شہزاد نیّر، جہلم، بک کارنر، ص ۱۴۲

۳۴۔ آثم کھیازئی، محمد حسن (۱۸ ستمبر ۲۰۱۹) "میرا شاعر میرا دوست" مشمولہ روزنامہ مِٹھن، راجن پور، چیف ایڈیٹر، محمد حفیظ النصیر، ص ۱

باب چہارم

شہزاد کی غزل اور شعری مقام و مرتبہ

اردو شاعری میں غزل کی روایت

شہزاد نیّر کی غزل کا فکری و فنی جائزہ

شہزاد نیّر کا شعری مقام و مرتبہ

باب چہارم

شہزاد کی غزل اور شعری مقام و مرتبہ

اردو شاعری میں غزل کی روایت اور ارتقاء:

اردو شاعری کی تمام اصناف میں غزل ایسی صنفِ سخن ہے جس کو شاعری میں سب سے زیادہ برتا گیا ہے اور ایک اندازے کے مطابق اردو ادب میں تخلیق کاروں نے اب تک سب سے زیادہ غزلیں کہی ہیں۔ غزل کیا ہے؟ اس کی تعریف نور اللغات (۱) میں کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

> "غزل (ع) مونث۔ لغوی معنے عورتوں سے باتیں کرنا اصطلاح میں وہ اشعار جن میں حسن و عشق و وصال و فراق اشتیاق جنون یاس وغیرہ کی باتیں جو عشق سے متعلق ہیں کہی جاتی۔ غزل ہر بحر میں کہی جاتی ہے۔ ہر شعر جداگانہ مضمون کا ہوتا ہے البتہ قطعہ بند میں یہ بات نہیں ہوتی، غزل کے پہلے شعر کو مطلع آخر کو مقطع اور سب سے عمدہ شعر کو شاہ بیت کہتے ہیں۔ مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور باقی اشعار کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔"

نور الحسن نیّر کی کی گئی اس تعریف سے غزل کے مزاج کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے کہ غزل ایسی صنف ہے جس میں عشق و محبت کے مضامین کو باندھا جاتا ہے اور اس میں شاعر اپنے محبوب سے اپنے عشق و محبت کی داستان کو بیان کرتا ہے۔ غزل اردو شاعری کی سب سے جاندار صنف کہلائی جاسکتی ہے جو بہت سی لطافتوں، نزاکتوں اور رمز و ایمائیت سے بھرپور ہے اور تمام تر مخالفتوں کے باوجود آج بھی اپنی مخصوص انفرادیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ غزل فارسی اور اردو شاعری کی اہم ترین اور قدیم اصنافِ سخن میں سے ایک ہے اور غزل فارسی میں عربی قصیدے کی تمہید کو شامل کرنے سے آئی اور یہ جوڑ اس قدر مقبول ہوا کہ فارسی کی بیشتر اعلیٰ شاعری غزل میں ہی موجود ہے۔ اردو میں غزل فارسی کے ذریعے ہی آئی۔ غزل کی تعریف کرتے ہوئے انور جمال (۲) لکھتے ہیں۔

> "غزل شاعری کا وہ پیکرِ حسن ہے جس میں پانچ یا زیادہ اشعار ہوتے ہیں۔ رمز، ایما، اینائیت، سوز و گداز، موسیقیت اور ایجاز اس کے کیفیتی (باطنی) خواص ہیں۔ وارداتِ

حسن و عشق، کربِ ذات کا بیان، غمِ دوراں کا تذکرہ اس کے موضوعات ہیں۔ پہلے شعر (مطلع) کے ہر دو مصرعوں میں ردیف و قافیے کا التزام اور پھر ہر شعر کے مصرعِ ثانی میں مطلع کے ردیف قافیے کی پابندی اس کے خارجی اور ہیئتی اصول ہیں۔"

غزل ایسی صنف ہے جو بہت مقبول اور ہر دل عزیز رہی ہے اور کلاسیکی عہد سے لے کر جدید شاعری کے رجحان تک ہر دور میں اس نے اپنا تشخص اور انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ اردو شاعری میں سب سے زیادہ اکثریت غزل گو شعرا کی ہے۔ اردو کے مقبول ترین شعراء ولی، سراج، میر، غالب، آتش، مومن، داغ اور ناسخ کی شہرت کی وجہ یہ صنفِ غزل ہی ہے اگر ان کی شعری کاوشوں سے ان کی غزلوں کو نکال دیا جائے تو ان کے شعری دامن میں خس و خاشاک کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ غزل کی ابتدا عشق و عاشقی کے مضامین سے ہوئی مگر بعد میں تصوف و عرفان کے موضوعات بھی غزل کے دامن میں جمع ہوتے گئے اور عصرِ حاضر تک آتے آتے غزل کا دامن نت نئے موضوعات سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ غزل کی صنف پر اپنے خیالات کا نہایت خوبصورت اظہار کرتے ہوئے عبادت بریلوی (۳) رقمطراز ہیں۔

"غزل ایک تہذیب کی زبان ہے۔ اور اس کا مزاج ایک تہذیب کا مزاج ہے۔ اس کا جمالیاتی اظہار بھی اسی تہذیب کے مزاج کے تابع ہے۔ یہ تہذیب سیدھی اور سپاٹ نہیں۔ پہلو دار اور تہہ دار ہے۔ اس میں سادگی بھی ہے اور پُرکاری بھی۔ سلاست بھی ہے رنگینی بھی۔ اور ان سب کے اثرات بھی غزل کی صنف میں ملتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے مزاج کا خمیر درحقیقت اسی تہذیب سے اُٹھا ہے۔ غزل ہیرے کی طرح تراشی ہوئی صنفِ سخن ہے۔ وہ آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے، دلوں کو لبھا سکتی ہے، حواس پر چھا سکتی ہے، روح پر منڈلا سکتی ہے۔"

غزل کی صنف بہت سی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے جن میں سے بنیادی خصوصیت اس کی داخلیت پسندی ہے۔ غزل کا شاعر اپنی تمام تر توجہ اپنے دل کی کائنات پر رکھتا ہے اور اسی کائنات کے مظاہر کو وہ کاغذ پر اُتار دیتا ہے۔ شاعر اپنے خارجی تجربات کو بھی اس پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ وہ اس کے دل کی داستان معلوم ہوتے ہیں۔ غزل کی دوسری اہم خصوصیت اس کی ایمائیت ہے۔ غزل ہمیشہ علامات و استعارات کے پردے میں کہی جاتی ہے اور

نہایت سادہ لفظوں میں جہانِ معانی سمونے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ غزل کی ایک اوراہم خصوصیت اس کا اختصار ہے۔ شاعر اپنے خیال کی تمام تر وسعت اور گہرائی شعر کے دو مصرعوں میں سمو دیتا ہے۔ غرض کہ غزل اپنے دامن میں بڑی وسعتیں رکھتی ہے۔ اس میں سادگی ہے، درویشی ہے اور زندگی کے تمام پہلوؤں کی ترجمانی ہے۔ رضوی (۴) غزل پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "غزل ایک ساز کی طرح ہے، اس کا ہر شعر ایک تار ہے۔ ہر تار کی آواز مختلف ہے مگر ان آوازوں کے امتزاج سے ایک ایسا نغمہ ترتیب پاتا ہے جو سازوآواز سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں گلال برسا دیتا ہے۔"

غرض کہ اردو شاعری میں غزل کی صنف ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے اور یہ صنف تمام تر انفرادیت کے ساتھ اپنا ایک جداگانہ مزاج رکھتی ہے۔ غزل کا یہ مزاج زندگی کے تمام رنگوں سے ہم آہنگ ہے اور اس میں زندگی بستی اور سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔

غزل کے آغاز کے متعلق بات کی جائے تو اردو میں غزل کا آغاز فارسی اور ہندی کے تال میل کے تجربات یعنی ریختہ گوئی سے ہوا۔ اردو غزل کی ابتدائی ترین شکل بھی ریختہ ہی کی صورت میں ملتی ہے۔ بعض محققین اردو غزل کا اولین نمونہ حضرت بابا فرید سے منسوب کرتے ہیں جبکہ بعض اس کی تردید بھی کرتے ہیں۔ سولہویں صدی میں جا کر بعض اردو شعراء کے ہاں غزل گوئی کی روایت کا باقاعدہ اظہار ملتا ہے جن میں شیخ جمالی، موید بیگ اور مشہدی بخاری نمایاں ہیں۔ ان شعراء کی غزلوں پر فارسی اثرات غالب نظر آتے ہیں اور ان قدیم غزلوں کے نمونوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو غزل ابتدا ہی سے فارسی روایت کے تابع رہی ہے بابا فرید سے ولی دکنی تک غزل کا تشکیلی سفر اس بات کا گواہ ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں لکھی گئی غزلیات اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ اس کے عہد میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے باقاعدہ کوششیں کی گئی اور اردو زبان کی قدر و منزلت میں اضافہ بھی ہوا اس عہد میں پنڈت چندر بھان برہمن نے اردو کی پہلی باقاعدہ غزل لکھی جس کے تمام الفاظ اردو کے تھے جبکہ عادل شاہی دور میں جہاں زیادہ تر شعراء کی توجہ مثنوی کی طرف رہی وہیں اسی دور میں حسن شوقی نے جدید غزل کی روایت کا ابتدائی نقش ثبت کیا۔ حسن شوقی کے بعد غزل کا اہم شاعر قلی قطب شاہ ہے جس نے اردو میں پہلی بار فارسی ہی کی طرز پر اپنا دیوان

مرتب کیا۔ قلی قطب شاہ کے دیوان میں کثرت سے مسلسل غزلیں ملتی ہیں۔ شوقی اور قلی قطب شاہ کے کام کو کامل ترین شکل ولی دکنی نے دی۔ ولی نے اردو غزل کو اپنی فنی مہارت سے اس حد تک چمکا دیا کہ اس کے جلوے تمام اصنافِ سخن پر چھا گئے۔ ولی نے غزل کو ایک مستقل صنف کا رنگ اور آہنگ بخشا اور غزل اردو شاعری میں ایک کامیاب اور مقبول ترین صنف کے طور پر رائج ہو گئی۔ ولی سے پہلے اردو زبان یعنی ریختہ کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس میں باضابطہ طور پر شاعری کی جائے اور بڑے طبقہ کے روساء اور شعراء فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے ایسے میں ولی نے دکنی ہندوی اور فارسی کے ملاپ سے ایک ایسی زبان میں شاعری کی جو اپنی سادگی اور تازگی کی وجہ سے جلد مقبول ہو گئی اسی وجہ سے محمد حسین آزاد نے ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا اور ان کے مطابق ولی کا درجہ اردو شاعری میں وہی ہے جو چاسر کا انگریزی میں ہے۔ نورالحسن ہاشمی (۵) رقمطراز ہیں:

> "یہ بات ولی کی قسمت میں تھی کہ انہوں نے غزل گو کی حیثیت سے سترھویں صدی کے آخر اور آٹھارویں صدی کے پہلے ربع میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور دونوں محاذوں پر کامیاب رہے ایک تو زبان کی تشکیل نو کرنے کی حیثیت سے، دوسرے غزل میں مختلف النوع قسم کے مضامین پیش کر کے۔ اگرچہ غزل کی ہیئت میں انہوں نے دکنی انداز کے ان عناصر کو جو برقرار رکھنے کے لائق تھے قائم رکھا لیکن انہوں نے اس میں اپنے تازہ اور منفرد اسلوب سے ایک جدید رنگ و آہنگ ضرور پیدا کر دیا۔"

ولی ایسے شاعر تھے جنہوں نے غزل کے محدود تصور کو وسعت سے ہمکنار کر دیا اور غزل میں روایتی و رسمی عشق کے موضوعات کے ساتھ ساتھ تصوف اور انسانی زندگی کے دوسرے موضوعات بھی ایک تنوّع کے شامل ہو گئے۔ ولی نے اپنے کلام میں نادر تشبیہات و استعارات کو نہایت خوبی سے استعمال کیا اور اپنے کلام کی روانی و تاثیر میں کئی گنا اضافہ کر دیا کہ ولی کا کلام آج بھی اپنے اندر ایک نیا پن لیے ہوئے ہے۔ ولی کے کلام میں رنج و غم نہیں بلکہ ایک طبعی بشاشت رچی بسی ہوئی ہے ولی ایک شگفتہ مزاج اور فصاحت پسند شاعر تھے ان کے کلام میں موجود آہنگ اور موسیقیت بھی ان کو اپنے عہد کے شعراء میں نمایاں کرتا ہے اور انہیں ایک منفرد اسلوب کا حامل بناتا ہے۔ صادق (۶) ان کے کلام کی اہمیت اور ان کی شاعری کے اہم پہلوؤں پر لکھتے ہیں۔

"ولی کی شاعری کے چار نہایت اہم پہلو ہیں۔ تاریخی، ثقافتی، فنی اور جمالیاتی۔ تاریخی لحاظ سے وہ اس وجہ سے اہم ہے کہ اس کے زیر اثر شمالی ہند میں جدید شاعری کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ یہ اسلوب تمام ملک پر چھا گیا۔ اس لیے اگر آزاد کے الفاظ میں اسے اردو شاعری کا باوا آدم کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ لسانی اعتبار سے اس لیے وقیع ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کے دور میں شمالی ہند کی زبان گجرات اور دکن میں عام طور پر رائج ہو چکی تھی اور وہ ٹھیٹھ ہندی یا دڑاوری عناصر کو اس کے پیش رووں میں غائب ہو رہے تھے یا پسپائیت کی حالت میں تھے۔ فنی اعتبار سے اس کی شاعری اس کی قادرالکلامی پر دلالت کرتی ہے اور جمالیاتی نقطہ نظر سے اس کا منتخب کلام قاری کو وہ فرحت بخشتا ہے جو فنونِ لطیفہ کا فرضِ اولیں شمار ہوتا ہے۔"

ولی کے بعد میر و سودا کا عہد اردو غزل کی تاریخ کا عہدِ زریں تصور کیا جاتا ہے۔ سودا جہاں قصیدہ کے امام ہیں وہیں انہوں نے غزل کے میدان میں بھی ایک نمایاں سرمایہ چھوڑا ہے۔ سودا کی غزلوں میں ہمیں قصیدے کی سی خارجیت، معنی آفرینی، تمثیل نگاری اور خیال بندی ملتی ہے اور سودا کی غزل کا لہجہ اور زبان قصیدے جیسی ہے اور سودا نے اپنے اسلوب کے جلال کو قائم رکھتے ہوئے بلند آہنگ کا استعمال کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں ایک تنّوع اور رنگا رنگی بھی موجود ہے۔ میر تقی میر اردو شاعری کے عہدِ زریں کے سب سے بڑے معمار سمجھے جاتے ہیں انہوں نے سادگی و سلاست کو اپنا رہنما بناتے ہوئے اپنی وارداتِ قلبی کو نہایت پُر اثر انداز میں شعر کیا ہے۔ میر کے ہاں غزل کا ایک بڑا نکھرا ہوا روپ ملتا ہے اور میر کی شاعری کے امتیازی نشان ان کی نغمگی و موسیقیت ہیں۔ نورانی (۷) لکھتے ہیں:

"میر اردو کے ان چند گنے چنے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جو اردو زبان کے معمار تھے اردو شاعری میں صنف غزل سب سے زیادہ اہم ہے اور میر رنگِ تغزل میں آپ اپنی نظیر تھے۔ میر کی زندگی مصیبتوں اور تکلیفوں میں گزری اس لئے ان کے کلام میں غم اور مایوسی کا اثر غالب ہے، سوز اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ عشق و محبت کے کوچے بھی میر کے دیکھے بھالے تھے انہوں نے محبت کے چرکے سہے تھے۔ اسی لئے اس کی کیفیتوں کو بڑی صداقت اور خلوص سے بیان کیا ہے۔"

خواجہ میر درد بھی اس عہد کاایک اہم نام ہیں جنہوں نے اپنی روحانی کیفیات اور تصوف کے اظہار کے لیے شاعری کو ذریعہ بنایااور اردو غزل میں تصوف کے گل بوٹے سجائے۔ان کا تصوف صرف چند رسمی مضامین کے ہی بیان تک محدود نہیں بلکہ تصوف ان کی زندگی ہے۔دردؔ کے بیان میں صرف سادگی ہی سادگی ہے تصنع اور تکلف نہیں۔اردو غزل میں تجربات کے حوالہ سے دبستانِ لکھنو کے شعراءنے بھی کافی حد تک اضافہ کیا اوراس سلسلہ میں ناسخ کی اصلاحِ زبان کی کوششیں نہایت اہم ہیں۔دہلویت کے آخری دور کے نمائندہ غزل گو شاعر مصحفیؔ،انشاؔ،جرات،رنگینؔ اور ان کے معاصرین تھے۔اس دور میں غزل کارنگ اورآہنگ بدلنے لگااور درباروں اور شاعروں کے اثر سے غزل کے مزاج میں کافی حد تک تبدیلی پیدا ہوگئی۔سادگی کے مقابلے میں لفظی صناعی پر زیادہ زور دیا گیا اور غزل محض خیالی مضامین تک محدود ہو کر رہ گئی۔ مصحفیؔ کو اردو کا سب سے پُر گو شاعر مانا جاتا ہے اوران کے کلام میں تمام شعراء کا اندازِ سخن اپنی جھلک دکھاتا ہے۔انشاء ایک قادرالکلام شاعر تھے جو کہ زبان کے اسرازورموز سے مکمل طور پر واقف تھے اور انہوں نے اردو شاعری میں ہندی الفاظ و محاورات کو استعمال کیااس کے علاوہ انہوں نے صنف ریختی کو بھی فروغ دیا مگران کے کلام کا بیشتر حصّہ محض عشق و محبت کے جنسی جذبات کی آسودگی تک محدود ہے۔ جرات اردو میں معاملہ بندی کے استاد مانے جاتے ہیں۔ان کی غزل میں حقیقی جذبات و خیالات کا بے تکلف بیان موجود ہے۔ مصحفی،جرات اور انشانے جس نئے دبستانِ شعر کی بنیاد رکھی تھی ان کی تکمیل آتش وناسخ کے دور میں ہوئی۔ناسخ نے لکھنوئی غزل کو ایک نئے ذائقے اور رنگ سے آشنا کیااور انہیں دبستانِ لکھنو کا بانی کہا جاتا ہے انہوں نے لکھنو میں غزل کو ایک نئے لسانی ذائقے سے روشناس کروایا۔ذوق،مومن اور غالب جیسے شعراءنے ناسخ کے رنگِ سخن کی پیروی کی اور انہیں جدید شعری سخن کا موجد بھی تسلیم کیا۔حیدر علی آتش ایک ایسے شاعر تھے جنہوں نے لکھنوئی دبستان سے وابستگی کے ساتھ ساتھ دہلوی رنگِ سخن سے بھی استفادہ کرتے ہوئے اپنے کلام کو سلاست اور روانی جیسی خصوصیات سے مالامال کیا اور اس کے ساتھ ساتھ بے جالفظی شعبدہ بازی اور صنائع و بدائع کے غیر ضروری استعمال سے لکھنوئی شاعری کو پاک کرنے کی کوشش بھی کی۔ نظیر اکبر آبادی ایک ایسے شاعر تھے جو ان تمام شعراء سے قطع نظر رہے اورانہوں نے اپنی فطرت کی آزادہ روی کے باعث دہلی اور لکھنو کے شعری دبستانوں سے الگ اپنا ایک منفرد اسلوب اور رنگ و آہنگ اختیار کیا انہوں نے نظم کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی ہندی معاشرت اور تہذیب کو سمونے کی کوشش کی اور مقامی ہندی تلمیحات،الفاظ اور بولیوں کو اپنی غزلوں میں جگہ

دی۔ دبستانِ دہلی کے دوسرے دور میں جسے دورِ متاخرین بھی کہا جاتا ہے اردو غزل زبان و بیان کی نئی لذتوں اور ذائقوں سے آشنا ہوئی۔ شاہ نصیر، ذوق اور ظفر جیسے شعراء نے زبان کو نئے سرے سے تازہ کیا دوسری طرف مومن غالب اور شیفتہ جیسے شعراء نے اردو غزل کو فکر و فن کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

کلاسیکی شعراء میں غالب ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں اس اسلوب کا نیا پن کافی حد تک نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے روایت سے گریز کرتے ہوئے زبان و بیان اور اسلوب کے جو تجربے کیے ان کی بنیاد پر ہی انہیں جدید شاعری اور غزل کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ غالب نے غزل کے دامن کو کئی نئی وسعتوں اور جدتوں سے بھر دیا۔ انہوں نے اپنے عہد کے سیاسی و تہذیبی حالات اوران کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات کو نہایت خوبی سے اپنی غزل میں پیش کیا۔ غالب نے اردو غزل کو سوچنا سکھایا جبکہ اس سے پہلے غزل کی دنیا محض حسن و عشق کے مضامین تک محدود تھی ایسے میں غالب نے زندگی کے مسائل کو اپنی غزل میں پیش کیا۔ کلاسیکی اردو غزل میں غالبؔ پہلے شاعر ہیں جن کے ہاں اسلوب کا نیا پن نمایاں ہے اور اُن کے ہاں روایت سے گریز کے متنوع قرینے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اسلوب اور زبان و بیان کے جو تجربے کیے ان پر ایک پر شکوہ غزل کی تعمیر ہوئی جو غالبؔ جیسے نابغہ شاعر سے ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ صدیقی (۸) رقمطراز ہیں:

> "غالب بلاشبہ اپنے عہد کے بڑے شاعر ہیں شعر میں الفاظ کے دروبست کی وجہ کر نہیں (کیوں کہ اس سلسلہ میں ان کا اسلوب بدلتا رہا ہے) بلکہ ان خیالات کی وجہ سے اور زندگی کے اس نظریہ یا ان نظریوں سے جن سے ان کی شاعری انسانی جذبات احساسات فکر اور فکری امکانات جامر قع بنی اور مستقبل کے لیے ایک نمونہ بھی بنی ایسا نمونہ جس کی نقالی نہیں تقلید کی جائے اور جن قدروں کی نشاندہی اس میں ہے ان کو سمجھا جائے اور اجاگر کیا جائے ان کو زیادہ توانا بنایا جائے۔"

اقبال نے غزل کی روایت کو ایک نیا موڑ دیا اور غزل کی قدیم روایت سے انحراف کرتے ہوئے ان موضوعات اور عناصر کو جو پرانی غزل میں رائج تو تھے مگر انہیں مرکزی حیثیت حاصل نا تھی، اقبال نے انہیں مرکزی عناصر کی طرح برتا ہے اس کے علاوہ اقبال کی غزل کی نمایاں خصوصیت ان کا فکری پہلو بھی ہے اور انہوں نے کئی فلسفوں کو اپنی غزلوں میں بیان کیا ہے۔ اقبال کی غزل میں خیالات کا تسلسل ملتا ہے اور پراگندہِ خیالی ان کے یہاں نظر

نہیں آتی۔ غرض کہ اردو غزل نے قلی قطب شاہ سے ولی اور ولی سے میر تقی میر تک، میر سے غالب اور غالب سے اقبال تک کئی ارتقائی مراحل طے کیے۔ ان تمام شعراء نے اسالیب کے حوالے سے کئی تجربات کیے اور نئے نئے موضوعات کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ ان دوران جو بھی تحریکیں وجود میں آئی غزل نے ان سب کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے اپنی روایت کو مضبوط سے مضبوط تر کیا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں حسرت موہانی، اصغر کونڈوی، جگر مراد آبادی، فانی بدایونی اور مرزا یاس یگانہ نے غزل کی نئے سرے سے آبیاری کی ان شعراء نے غزل کی کلاسیکی روایت سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں جدت اور تازگی پیدا کی۔ ان شعراء کی ہی کوششوں سے جدید غزل کلاسیکی غزل سے بہت حد تک الگ ہو گئی۔ حسرت موہانی نے بڑی آہستگی اور شائستگی سے غزل کے مزاج کو رفتہ رفتہ تبدیل کر دیا اور وہ بیسویں صدی کے نصف دوم میں ایک توانا آواز کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ شوکت علی فانی بدایونی قنوطی مزاج کے حامل شاعر تھے اور ان کی ساری شاعری کی فضا سوگوار ہے مگر ان کی شاعری کا کمال ان کی فنی مہارت اور ہنر مندی ہے انہوں نے اپنی زندگی کے فلسفے کو اپنی شاعری میں نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ اصغر کی شاعری تصوف کے رنگ لیے ہوئے ہے۔ رشید احمد صدیقی کے مطابق آپ عوام نہیں خواص کے شاعر ہیں۔ جگر مراد آبادی حسن و عشق کے شاعر تھے مگر ان کی شاعری میں موضوعات کی تقلید نہیں بلکہ ایک نیا پن ملتا ہے اور ان کا عشق پاکیزہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ فراق ایسے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کی زبان میں وسعت اور تنوّع پیدا کیا اور ان کا اپنے عہد کے منفرد اور ممتاز غزل گو شعراء میں خاص مقام ہے۔ حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری اور صوفی تبسم ایسے شاعر ہیں جو غزل کے جدید دور میں بھی کلاسیکی اور فارسی غزل کی روایات سے جڑے رہے۔

تقسیم کے واقعات اور حالات نے ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا اور اس وقت کے شعراء نے اپنے عہد کے حالات و واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کیا اور ان کو اپنے خاص اسلوب اور انداز کے ساتھ غزل میں سمو دیا۔ ترقی پسند شعراء نے غزل گوئی کی طرف بھی توجہ کی مگر اشتراکیت کا جتنا واضح اظہار ترقی پسندوں نے افسانوی ادب اور نظم کے میدان میں کیا غزل میں نہ کر سکے۔ اس حوالے سے صدیقی (۹) لکھتے ہیں

> "اکثر ترقی پسند غزل گو ہیں لیکن جس کو ترقی پسند غزل گوئی کہہ سکیں وہ نظر نہیں آتی۔ سوا فراقؔ اور فیضؔ کی غزل کے جس میں نئے رجحانات کے بعض جمیل و جامع نمونے ملتے ہیں۔ ترقی پسندی اب تک غزل کو اپنی کوئی واضح چھاپ نہیں دے سکی

ہے۔باوجود اس کے کہ نئی اصطلاحات اور موضوعات کا غزل میں بڑی آزادی
سے اضافہ کیا گیا ترقی پسندوں کی غزل گوئی سے غزل "ترقی پسند" نہ ہوئی۔"

ترقی پسند غزل گو شعرا میں فیض سب سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں اور فیض غزل کے مقام و مرتبہ سے بخوبی آگاہ دکھائی دیتے ہیں انہوں نے اپنے منفرد انداز سے شاعری اور موضوع کو یکجان کر دیا۔ دوسرے ترقی پسند شعراء میں ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی جان نثار اختر، عبدالحمید عدم، قتیل شفائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جبکہ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعراء میں مجید امجد اختر الایمان اور میراجی نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ مجید امجد کی غزلیں اپنی گہرائی اور نئے پن کی وجہ سے خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اختر الایمان کے اپنی شاعری کے آغاز میں غزلیں لکھیں لیکن ان غزلوں کو اپنے مجموعے میں شامل نہیں کیا۔

بیسویں صدی کا نصف آخر ادبی حوالے سے بڑا زرخیز دور ہے اور اس میں غزل میں ایک نئے دور کا اضافہ ہوا۔ جن شعراء نے اس دور میں غزل کو سنوارا اور اسے مختلف فکری رنگوں سے خوبصورت بنایا ان میں ناصر کاظمی، ساغر صدیقی، احمد فراز، شکیب جلالی، جون ایلیا، سیف الدین سیف، شہزاد احمد، ظفر اقبال، ثروت حسین وغیرہ قابلِ قدر ہیں۔ ان تمام میں سے جس شاعر نے سب سے پہلے اپنی انفرادیت تسلیم کروائی وہ ناصر تھے۔ ناصر کی شاعری میں بے چینی، ماضی پرستی اور رنج و الم کے عناصر نے ان کی غزلوں کو ایک خصوصی چمک عطا کی اور ناصر نے اپنی غزل میں جدید زمانے کے دکھوں کو سمو دیا۔ ناصر کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کاشمیری (۱۰) لکھتے ہیں:

"ناصر زیادہ دیر تک زندہ نہ رہے، لیکن جتنی دیر زندہ رہے بھرپور طریقے سے زندہ رہے، یہی وجہ ہے کہ وہ شخصیت کی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوئے، وہ اداسی، محرومی اور گم گشتگی کو بھی زندگی کی ایک اٹل حقیقت تسلیم کرتے ہیں اور اس حقیقت کا کھلے دل سے سامنا کرتے ہیں، لیکن جب نسوانی حسن کو دیکھتے ہیں، تو "ہوش کی تلخیوں" سے نجات پاتے ہیں، اور اشعار کے خواں نعمت سے خاطر مدارات کرتے ہیں، کیٹس نے درست کہا ہے کہ شعری کردار کا کوئی کردار نہیں ہوتا، یہ استواری اور یکسانیت کا شکار نہیں ہوتا۔ ناصر کاظمی یکسانیت اور یک رنگی سے دور بھاگتے ہیں، وہ قدم قدم پر تنوع پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔"

سلیم احمد جدید غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے اپنی باغیانہ غزل سے شاعری کی دنیا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ انہوں نے غزل میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا کہ غزل کلاسیکی انداز سے بالکل مختلف نظر آنے لگی۔ ان کی غزل کا ایک پہلو جنسی اسلوب کا تجربہ بھی ٹھہرا جس کے باعث جنسی معاملات کو پہلی بار غزل میں واضح انداز میں بیان کیا گیا۔ سلیم کے غزل کی روایتی زبان اور لفظیات کے خلاف ان تمام شعوری کوششوں اور تجربات کو اینٹی غزل کہا گیا۔ ساغر صدیقی ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں معاشرے کی اونچ نیچ کا گہرا مشاہدہ نظر آتا ہے۔ قاسمی کی غزل جدید رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ احمد فراز رومانی شاعر ہیں اوران کی غزلیں عہد جدید کا بالکل سچا پرتو ہیں۔ ساقی فاروقی کی شاعری پر انگریزی خیالات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے اور فن سے زیادہ فکر کی گہرائی کو ماپتے نظر آتے ہیں۔ شکیب جلالی نے اپنے فن سے نئی نئی علامتیں پیدا کیں اور اردو غزل میں نئی امیجری کو فروغ دیا تو ظفر اقبال نے لسانی تجربوں سے لفظ اور اسلوب کے نئے اشارے روشن کیے۔ احسان دانش کی شاعری زندگی کی کم دیکھے جانے والی حقیقتوں سے لبریز نظر آتی ہے اور ان کا شمار اردو غزل کے بڑوں میں کیا جاتا ہے۔ شہزاد احمد نے اپنے اسلوب کی تازہ کاری سے غزل کو نئے شعور سے آگاہ کیا اور غزل میں نئے مضامین کو متعارف کروایا اسی طرح وزیر آغا کی غزلیں جدت طرازی اور ندرت ادا میں اپنی مثال آپ ہیں۔ سیف الدین سیف کی غزل میں ناسٹلجیا ہے جو کہ اس کا درد بھی ہے اور دوا بھی اور اس کی غزلیں سادہ اور سلیس الفاظ کا مجموعہ ہیں شاعرات میں ادا جعفری اور پروین شاکر نمایاں ہیں پروین نے اپنی غزل میں سادگی اور مرقع سازی کے ایک نئے آہنگ کا تجربہ کیا ہے تو ادا نسائی لب و لہجے کی بہترین امین ہیں جس نے مستورات کے دلی مسائل غزل میں عمدگی سے سمو دیے ہیں۔ ان کے علاوہ تنویر سپرا، امین راحت چغتائی، محبوب خزاں، قابل اجمیری، محسن بھوپالی، رشید کامل، رام ریاض، اطہر نفیس، احمد مشتاق، مشفق خواجہ، ناصر شہزاد، اقبال ساجد، سلیم بے تاب، عابد صدیق، محسن نقوی اور ثروت حسین جدید غزل کے اہم شعراء ہیں جن کی غزلِ جدید کے لیے کی گئی کاوشوں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

غرض کہ اردو غزل جو کہ ولی دکنی کے کلاسیکل عہد سے شروع ہوئی اور درجہ بہ درجہ ترقی وارتقا کی منزلیں طے کرتی گئی اس نے کوچۂ محبوب سے کوچۂ دار ورسن تک کا سفر طے کیا آج اپنے پورے قد سے کھڑی ہے اور ایک خاص مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ اس مقام تک آتے آتے اور یہاں پہنچتے پہنچتے کاروانِ غزل کو بہت سی مشقتیں اور دشواریاں جھیلنی پڑیں لیکن غزل نے اپنی کامیابی کا سفر روکا نہیں بلکہ ہر آنے والا دن اس کے لیے نئی کامیابی کی نوید

لایا۔ایک طویل ارتقائی سفر طے کرنے کے بعد آج کی غزل اس قابل ہو چکی ہے کہ وہ زندگی کی جیتی جاگتی اور ٹھوس حقیقتوں کو بیان کر سکے۔ آج کی غزل میں دلچسپی کے ڈھیروں عناصر موجود ہیں،اس میں عشق و محبت کے ساتھ ساتھ فقر و درویشی کا ذکر بھی موجود ہے،اس میں تہذیب و ثقافت کی جلوہ گری بھی جابہ جا نظر آتی ہے اور آج کے انسان کے معاشی و نفسیاتی مسائل کا بیان بھی ملتا ہے۔ردولوی(۱۱)لکھتے ہیں:

> "آج کی غزل بلند آہنگی کی غزل ہے نہ دھیمے پن کی غزل،اس میں احتجاج بھی ہے اور فقر و درویشی بھی۔ محبت بھی ہے،شکایت و خفگی بھی،گفتگو بھی ہے اور خاموشی و سرگوشی بھی اور کبھی کبھی ایسی خاموشی جو کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتی ہے۔خاص طور پر یہ خاموشی عشقیہ شاعری میں نظر آتی ہے۔یوں تو غزل میں ہمیشہ عشقیہ شاعری کا حصہ نصف سے زیادہ رہا ہے لیکن یہ عشق یا تو فرشتوں جیسا رہا یا پھر،چوما چاٹی،کی سطح پر اُتر آیا۔وہ محبت جسے واقعی محبت سے تعبیر کیا جائے ملتی ضرور ہے لیکن کم۔ہم عصر غزل نے اسے زندگی کے ایک پہلو کی طرح برتا اور اسی سپردگی کے ساتھ پیش کیا۔"

مختصر کہ غزل ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہے اور اس نے ہمیشہ ہر دور میں اس عہد اور تہذیب کی ترجمانی کی ہے۔اکیسویں صدی کے اہم اور معتبر غزل گو شعراء میں نوجوان شعراء کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے جنہوں سے عام ڈگر سے انحراف کرتے ہوئے اپنے لیے ایک الگ راہ کا تعین کیا ان میں ایک اہم نام شہزاد نیّر کا ہے جس نے روایت سے اپنا تعلق استوار رکھتے ہوئے جدیدیت کے راستے پر قدم رکھا اور نہایت سبک روی سے آگے بڑھتے رہے اور آج ایک بلند مرتبہ شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

شہزاد کی غزل کا فکری و فنی جائزہ:

ہم جانتے ہیں کہ شہزاد بطور نظم گو خصوصی انفرادیت کے حامل ہیں اور جدید نظم گو شاعروں میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں لیکن شہزاد نظم کے ساتھ ساتھ غزل کے میدان کے بھی شہسوار ہیں اور نظم اور غزل دونوں باکمال کہتے ہیں۔ ان کی غزلیں فن پر ان کی گرفت،برجستگی اور تازگی کی زندہ مثالیں ہیں۔ان کی غزل ایسی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے جو انہیں ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔شہزاد کے دوسرے شعری مجموعہ "چاک سے

اُترے وجود" اور چوتھے شعری مجموعہ "خوابشار" میں شامل غزلیں اس بات کی واضح گواہی پیش کرتی ہیں کہ شہزاد خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں اور ان کی غزلوں میں ان کا فکری ارتقاء صاف پہچانا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی رنگینی باہم یکجان ہو کر اس طرح ملتی ہے کہ الفاظ کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے

نظم اور غزل کے مزاج میں بہت فرق پایا جاتا ہے اوران دونوں میدانوں میں ایک ساتھ اپنی شناخت بنانا آسان کام نہیں لیکن اس سلسلے میں شہزاد نے بہت محنت اور طویل ریاضت کی ہے۔ حفیظ (۱۲) لکھتے ہیں:

> "نظم اور غزل کہنے میں موڈ، اندازِ بیاں، تکنیک، روایت اور رجحان سمیت کئی عناصر و عوامل کا فرق بہت توجہ، محنت اور مشق کا متقاضی ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں جس عنصر نے شہزاد نیّر کی زیادہ استعانت کی وہ اس کی بنیادی شعری تربیت تھی جس نے اسے روایت سے مربوط رکھا ہوا تھا۔ پھر تازہ فکری رویے نے اسے غزل میں انفرادیت کی جانب مائل کیااوراسی کا اعجاز ہے کہ شہزاد کی غزل فرسودگی سے پاک ہے اور اُس کا تغزل بھی نئے پن کا آئینہ دار ہے۔"

شہزاد کی غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ فنی اور فکری دونوں حوالوں سے شہزاد کی غزل جدید غزل کے معیار پر پورا اترتی ہے اور انہوں نے ادب کے محاز پر اپنی فنکارانہ مہارت اور قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ شہزاد خود کو شاعری کی صرف چند جہات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ متنوع موضوعات پر اپنی شاعرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ شہزاد کی غزل کے نمایاں موضوعات میں رومانویت پسندی، تصوف، سماجی شعور، حقیقت بیانی، اداسی، رجائیت اور حالات حاضرہ کے موضوعات ہیں۔ ان کی غزلوں میں عہدِ جدید سے جڑے ہوئے تمام مسائل یعنی فرد کی بے چارگی، تنہائی، بھوک و افلاس، زندگی کی بنیادی ضروریات کی عدم فراہمی اور دہشت گردی وغیرہ نے بہ خوبی اپنی جگہ بنائی ہے۔ شہزاد نے ان تمام مسائل کو فنی تقاضوں پر سمجھوتہ نا کرتے ہوئے عمدہ طریقے سے غزل کیا ہے شہزاد نے حسن کاری اور تعقل پسندی کو باہم ملا کر اپنی غزل میں جگہ دی ہے۔ راؤ (۱۳) رقمطراز ہیں:

> "شہزاد نیّر کی غزلوں میں رومانویت، نئے الفاظ و تراکیب محاورات اور روزمرہ کا استعمال، دراصل ان کے فکر و فن کی دوامیت کا امین ہے۔ وہ معاشرتی حقائق کا بیان ایک لوچ

دار، رسیلے اور پر سوز انداز میں کرتے ہیں تا کہ زندگی کے تلخ حقائق کے اظہار کے لیے شیریں انداز اختیار کیا جاسکے۔"

روشن خیالی اور منطقت پسندی شہزاد کے کلام کا خاصہ ہیں اور ان کی بنیادی شعری تربیت اور روایت اور جدت کا خوبصورت امتزاج ان کی غزل میں محسوس کیا جاسکتا ہے فنی اور فکری دونوں حوالوں سے شہزاد کی غزل لائقِ توجہ ہے اور انہوں نے فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ فنی رویوں کو بھی اپنی غزل میں اپنایا ہے اور یہ ہی ایک اچھی غزل کا تقاضا ہے۔ذیل میں ان کی غزل کے چند فکری پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اوران کی شاعری کے چند نمایاں موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔

رومانویت پسندی:

رومانویت اور رومان پسندی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے اور مغربی شعراء سے لے کر مشرقی شعراءتک سب کی شاعری پر رومانویت کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔رومان سے مراد روایت سے بغاوت ہے۔رومانویت کی تعریف کرتے ہوئے حسن(۱۴)لکھتے ہیں:

"رومان کا لفظ،رومانس سے نکلا ہے اوررومانس زبانوں میں اس قسم کی کہانیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو انتہائی آراستہ اور پُر شکوہ پس منظر کے ساتھ عشق و محبت کی ایسی داستانیں سناتی تھیں جو عام طور پر دورِ وسطیٰ کے جنگ جو اور خطر پسند نوجوانوں کے مہمات سے متعلق ہوتی تھیں اور اس طرح اس لفظ سے تین خاص مفہوم وابستہ ہو گئے۔

ا۔ عشق و محبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانوی کہا جانے لگا۔۲۔ غیر معمولی آراستگی شان و شکوہ، آرائش، فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی کو رومانوی کہا جانے لگا اور ۳۔عہدِ وسطیٰ سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانوی کا لقب دیا گیا۔"

شہزاد کی غزل کا مطالعہ کریں تو اس پر رومانویت کا گہرا اثر چھایا نظر آتا ہے۔ مگر ان کے ہاں رومان کی کیفیت روایتی نہیں بلکہ منفرد اور اچھوتی ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں روایت کی بغاوت سے لے کر عشق و محبت کے جذبات تک رومانویت کا باقاعدہ اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ عشق کا موضوع غزل میں اس قدر نمایاں حیثیت کا حامل ہے کہ کسی سیاسی یا معاشی صورتحال کا تذکرہ ہو یا پھر کسی اور مسئلے کا بیان غزل میں عشق ہی کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ مگر شہزاد کا عشق روایتی عشق نہیں بلکہ ان کے عشق کا دائرہ انسانیت کے تمام مظاہر تک پھیلا ہوا ہے۔ شہزاد رومانوی مزاج کے حامل شاعر ہیں اور رومانیت ان کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے۔ رومانوی شعراء مناظرِ فطرت سے رنگین موسموں سے، داخلی جذبات سے، ماضی کی یادوں سے اور مستقبل کے خوابوں سے متاثر ہوتے ہیں اس تناظر میں شہزاد کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ان کے بہت سے اشعار جو مختلف غزلوں میں بکھرے پڑے ہیں رومانویت کے ان تصورات پر مکمل طرح سے پورا اُترتے ہیں۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی محرک قوت عشق ہی ہے جو زندگی جینے کے ہنر سے آگاہ کرتی ہے اور ان کا شمار اس قبیلے کے لوگوں سے ہے جو بس محبت کرنے کے لیے اس دنیا میں آئے ہیں۔

میں مائلِ انکار تو ہو جاتا ہوں، دنیا!
دل مجھ کو محبت سے مکرنے نہیں دیتا
(چاک سے اُترے وجود، ص ۷۲)

سحر (۱۵) لکھتی ہیں:

"شہزاد نیّر کا جذبۂ عشق الفاظ و معانی سے آزاد ہے۔ اظہار کے اہتمام سے بے نیاز، پھوار جیسی نرمی، ٹھنڈک اور مٹھاس لیے ہوئے روح کو سرشار کرنے والا۔ آواز و انداز ساتھ نہ دے، آنکھیں نم ہو جائیں، بہت کچھ کہنے کی خواہش، صدیوں کے فاصلے درمیان میں حائل۔ لیکن ان کا جذبۂ احساس، عشق کے روبرو ہونے سے مشروط نہیں۔ رنگ و خوشبو میں ڈوبے ہوئے محبت کے مناظر ان کے سامنے ہیں۔ فضائیں نگہتوں سے سرشار ہیں۔ محبت ان کی کل کائنات ہے۔ حقیقی یا پھر تخیلاتی کائنات! لیکن وہ اپنی اس کائنات میں خوش ہیں۔"

شہزاد محبت میں اپنا آپ لٹائے چلے جارہے ہیں اور کہتے ہیں

میں محبت میں لُٹا جاتا ہوں
رائگانی ہے کمائی میری

(خوابشار ص ۳۴)

آج کل کے دور میں جب عشق و محبت اور خلوص کی کوئی قدر و قیمت نہیں شہزاد اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ اس عہد میں کیا کیا جائے۔

ہائے اب ہم کیا کریں اس عہد میں
عشق کارِ رائگاں جانا گیا

(خوابشار ص ۳۶)

شہزاد محبوب کے حسن سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور اس کا دم بھرتے بھی نظر آتے ہیں

بدن میں نرم حرارت کی باس گھلنے لگی
کھلا کھلا تیری زلفوں کا سائباں کھلا
(چاک سے اُترے وجود، ص ۳۵)

لیکن اس کے حسن سے جلوؤں سے بھی ڈرتے بھی ہیں کہ یہ جلوے ان کو تکلیف پہنچانے کے لیے ہیں:

اس کا آنچل لہراتے ہی
جنگل، بادل، دل مہکا ہے
(خوابشار ص ۸۸)

لیکن پھر بھی محبت کے جذبات سے مکرنا نہیں چاہتے اور جیسا ان کا محبوب خواہش کرتا ہے ویسا ہو جانا چاہتے ہیں اور بُرا ہونے کو بھی برا نہیں سمجھتے۔

؎میں برا ہونے کو اب کیسے برائی سمجھوں
اُس کا اچھا نہیں لگتا مرا اچھا ہونا
(خوابشار، ص۱۴۱)

؎ایسا سیّال بنایا تھا محبت نے مجھے
اُس کا جیسا مجھے کہنا مرا ویسا ہونا
(خوابشار، ص۱۴۲)

مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خودداری اور عزتِ نفس کو بھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔ شہزاد کی شاعری میں رومانیت کے یہ تمام عناصر نہایت اچھوتے اور معتبر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ شہزاد عشق و محبت کے رویتی مضامین کو بھی اپنی شاعری میں استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔

؎وہ اچانک لپٹ گئی مجھ سے
کتنا نادانِ عشق تھا میں بھی
(خوابشار ص۳۷)

؎لَمس کی بارش کب برسے گی
جسم کا صحرا پوچھ رہا ہے
(خوابشار ص۸۹)

ہجر و وفراق:

شہزاد نے عشق و محبت سے موضوعات کے ساتھ ساتھ ہجر و فراق کے جذبات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ شہزاد کا محبوب اس دنیا کا ایک عام انسان ہے کوئی ماورائی مخلوق نہیں ان کا محبوب ان سے کج ادائی بھی کرتا ہے اور انہیں تکلیف بھی پہنچاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں بے قراری اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ مگر شہزاد

ہجر کے ان لمحات میں روایتی محبوب کی طرح برتاؤ نہیں کرتے بلکہ ان لمحات کو اپنی تکمیلِ ذات کے لیے بہت کارآمد سمجھتے ہیں۔ غلام نبی (۱۶) لکھتی ہیں:

"یوں لگتا ہے کہ شہزاد نیّر روایتی وصل سے کہیں زیادہ فراق کی کیفیت کو اہم جانتے ہیں۔ لمحات ہجر میں وہ دل گرفتہ، دل شکستہ احساس کو خود سے لپٹنے نہیں دیتے، وہ اس مرحلے میں بکھراؤ کی بجائے سمٹاؤ اور ٹھہراؤ کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ جذباتی بحران کے اس معاملے کو کس سہولت سے طے کرتے ہیں کہ غزل کا دامن وسیع ہونے لگتا ہے۔"

شہزاد ہجر کے لمحات میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

؎ میں تیرے وصل کی لذّت کا معترف ہوں مگر
تو اپنے ہجر میں مجھ کو اداس رہنے دے
(چاک سے اترے وجود، ص ۶۴)

؎ دکانِ وصل تو کھولے اُداس دل میں کوئی
خوشی سے ہجر کمائے تو عشق ہوتا ہے
(خوابشار ص ۶۱)

؎ میں دردِ ہجر کی شدت سے خوب واقف ہوں
سو آسرا تمہیں دیتا ہوں ڈگمگاتے ہوئے
(خوابشار ص ۱۴۴)

؎ لذّتِ درد کہاں، لذّتِ دیدار کہاں
نگہِ یار ! تُو جتنی بھی رسیلی ہوتی
(چاک سے اترے وجود ص ۵۲)

اُداسی:

شاعر کا دل بہت گداز اور حساس ہوتا ہے وہ اپنے ذاتی غموں کے ساتھ ساتھ ارد گرد ہونے والے واقعات و حادثات کا بھی گہرا اثر قبول کرتا ہے اور یہ داخلی اور خارجی غم اس کے کلام میں ایک اداسی کا رنگ شامل کر دیتے ہیں۔ ایک شاعر کے نزدیک غم بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ انسان کے اندار ایک ایسی طاقت پیدا کرتے ہیں جس سے اس کے اندر عاجزی اور دوسروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ شہزاد کی غزلوں میں ہمیں اداسی اور غم کی ملی جلی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ ان غموں کو قیمتی زادِراہ سمجھتے ہیں۔

؎ سینکڑوں آنسوؤں کی قیمت پر
خواب بس ایک دو لیے جائیں
اُن کو منزل سے قیمتی سمجھو
رنج راہوں سے جو لیے جائیں

(خوابشار ص ۲۲)

شہزاد دل میں جاری ٹوٹ پھوٹ کو بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دلِ ناتواں سے دوری ہی اختیار کی جائے۔

؎ اس جگہ ٹوٹ پھوٹ رہتی ہے
میرے دل میں نہ آیئے صاحب

(خوابشار ص ۲۰)

کہیں محبوب کا خیال انہیں رنجیدہ رکھتا ہے تو کہیں اپنوں کی دائمی جدائی انہیں تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ماں کی جدائی پر ان کا قلم آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہے ماں اور اہلیہ کی جدائی پر اپنے دل کا غم رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

؎ کیسے چلوں کہ رحمت یزداں نہیں رہی
ماں کی دعا بھی شاملِ ساماں نہیں رہی

(چاک سے اُترے وجود ص ۲۶)

؎جاں سے جانا روا ہے دنیا میں
جا کے آنے کا کچھ رواج نہیں
زندگی منہ چھپا کے کیوں روئے
موت ہے، کوئی اس کو لاج نہیں

(خوابشار ص ۷۳)

شہزاد نے اس اُداسی کو بھی کس خوبصوتی سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے کہ ان کی اُداسی سے بھی عشق ہونے لگتا ہے لکھتے ہیں:

؎نیستی ہے کمال ہستی کا
انتہائے طرب اداسی ہے

(چاک سے اترے وجود ص ۹۴)

؎دیکھ اُس حسنِ سوگوار طرف
دیکھ کتنی حسیں اداسی ہے

(چاک سے اترے وجود ص ۹۶)

سماجی موضوعات:

شہزاد کا عہد ایک سماج سے دوسرے سماج میں بدلاؤ کا زمانہ ہے جہاں ہمیں کئی کہانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں غربت، محرومی، بے روزگاری، خاندانوں کے ٹوٹنے کے مناظر، دہشت گردی، قتل وغارت آج کے انسان کے آلام و مسائل ہیں۔ آج کا انسان اپنی ذات میں تنہائی کا شکار ہے اور یہ تنہائی اس کے اندر تلخی اور کڑواہٹ بھر رہی ہے۔ شہزاد کی شاعری میں ان سب حالات ورجحانات کو کھلم کھلا بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ انہیں ماضی کے حالات سے آگاہی اور حال کے حالات کا تجربہ ہے جس کی وجہ سے ان کے قلم نے حکمت و دانائی کے ساتھ آج کے انسان کا نوحہ رقم کیا ہے۔ تاج (۱۷) لکھتے ہیں:

"کیا یہ حقیقت نہیں کہ قوتِ متخیّلہ کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ سریع اور تیز ہے؟شاعر اپنی تخیل پرواز کی صلاحیت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ان گنت اوران دیکھی دنیاؤں کے شاہد ہیں اور اگر شاعر کے انگ انگ کے احساسات کی ان تمام دنیاؤں کو محسوس کیا تو آپ کیا کہیں گے ؟شاعر شہزاد نیّر نے محسوسات اور واقعیت سے اپنے لفظوں کو نئی زندگی عطا کی ہے۔"

آج کا انسان خواہشات کے جنگل میں بھٹکتے ہوئے خود کو ہی ایذا پہنچانے سے گریز نہیں کر رہا

؎مجھے ہی بھوک میں کھانے کو دوڑے
تمنّااس قدر سفاک میری

(چاک سے اترے وجود ص۲۸)

آج کا انسان ذاتی رنجشوں کے دائرے میں الجھ کر اپنے تمام رشتوں کو بھلا چکا ہے اس کی کہانی شہزاد کچھ اس درد کے ساتھ بیان کرتے ہیں

؎دل میں ملال آگیا،لب پر سوال آ گیا
شیشے میں بال آ گیا،رشتے بُھلا دیے گئے

(چاک سے اترے وجود ص۳۲)

آج کل ہر طرف خوف کی فضائیں چھائی ہوئی ہیں اور انسان کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتا۔

؎میں نے کچھ خوف لرزتے ہوئی گھر میں رکھا
اور کچھ چلتے ہوئے زادِ سفر میں رکھا

(چاک سے اترے وجود ص۳۸)

؎خوف اتنا ہے کہ بازاروں کے سینے ساکت
قریہ قریہ کسی باغی کی صدا مانگتا ہے
(خوابشار ص۴۳)

ان حالات میں ہونا تو یہ چاہے کہ انسان اپنے دل و ماغ سے تمام سوچوں کو جھٹک کر خود فریبی میں مبتلا ہو جائے مگر حساس دل انسان ایسا بھی نہیں کر سکتے۔ان کے لیے معاشرے کی یہ تمام خرابیاں برداشت کرنا بہت اذیت ناک عمل ہے۔

؎جابجا دیکھنے پڑتے ہیں اُدھڑتے منظر
کاش اندر کو کُھلی آنکھ بھی سی لی ہوتی
(چاک سے اترے وجود ص۵۵)

؎جا بہ جا خون کے چھینٹے ہیں ہمارے گھر میں
کون سا ورد کرائیں کہ بلائیں جائیں
(خوابشار ص۲۶)

انسان جس کے اندر قدرت نے اتنی قوت و دانائی رکھ دی تھی کہ وہ ستاروں پر بھی کمندیں ڈال سکتا تھا آج زر کا غلام ہوا بیٹھا ہے اور بنیادی ضروریات کو بھی ترس رہا ہے۔

؎زمیں کو جانتے ہوئے، فلک کو تانتے ہوئے
میں آپ ہی اِمام تھا، غلام کیسے ہو گیا
(خوابشار ص۲۸)

؎گلیوں میں کہرام مچا تھا، آدم روزی مانگتا تھا
"رازق، رازِق"، سنتے سنتے سب کی نبضیں ڈوب گئیں
(خوابشار ص۹۹)

شہزاد آج کے دور میں جاری مذہبی تفرقہ بندی اور جنونیت کے سخت مخالف ہیں۔ آج مذہب کے نام پر لاکھوں لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے اور مذہب کے نام پر قتل و غارت کے بازار گرم کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بس ظاہری دکھاوے کے لیے مذاہب کا استعال کرتے ہیں۔

؎اُس سے ہم عشق پرستوں کا تقابل کیسا
شیخ تو اپنی عبادت کا صلہ مانگتا ہے
(خوابشار ص۴۲)

؎کچھ نہ مل پائے تو مجبور طبعیت انساں
مسجد ودیرو کلیسا سےدغا مانگتا ہے
(خوابشار ص۴۳)

جب کہ شہزاد کی نظر میں حقیقی عشق تو وہ ہے جو غنا کے راستے سے آئے

؎وہ حرص ہوتی ہے، آئے جو زر کے رستے سے
غِنا کی راہ سے آئے تو عشق ہوتا ہے
(خوابشار ص۶۰)

شہزاد اس مخالفت میں کبھی کبھی تو بغاوت پر اتر آتے ہیں اور اپنے جذبات اکا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

؎جو بانٹنے کو نکل پڑے ہو تو سب بلا امتیاز دینا
خدا کی صورت نہ چند لوگوں کو نعمتوں سے نواز دینا
(خوابشار ص۴۶)

؎میں نہیں یاد بھی کرتا کہ خدا رکھتا ہوں
میں کہ آشیفتہ سری میں ہوں اسدؔ سے بڑھ کر
(خوابشار ص۴۹)

روایت سے بغاوت اور انائیت کا جذبہ

شہزاد کی شاعری میں انائیت اور خودداری کے جذبات کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔ وہ ہر حال میں غلط کے سامنے سر نہیں جھکاتے بلکہ ڈٹ کھڑے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں

نہیں گِرا مِری قاتل انا کا تاج محل
میں مر گیا ہوں خود اپنے پہ وار کرتے ہوئے
(چاک سے اترے وجود ص ۲۱)

جب ضرورت تھی اُسی وقت مجھے کیوں نہ ملا
بس اسی ضد میں گنوا بیٹھا ہوں پایا ہوا شخص
(خوابشار ص ۱۴)

وہ برملا اپنی بے باک فطرت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں

میں چُپ رہتا تو بچ سکتی تھی گردن
مگر یہ فطرتِ بے باک میری
(چاک سے اترے وجود ص ۲۷)

پاسِ دامِ روایت نہیں کر سکا
اُڑ گیا میں اطاعت نہیں کر سکا
(چاک سے اترے وجود ص ۵۷)

محبت میں بھی وہ خودداری کا جذبہ خود پر حاوی رکھتے ہیں اور محبوب سے بھی فاصلہ رکھتے ہیں

؎اس سے کچھ نہیں مانگتا نیّر
کیا کرو گے جو مان بھی نا رہا
(چاک سے اترے وجود ص ۳۰)

شہزاد اپنے سخن اور لفظوں کی اہمیت سے بھی بخوبی آگاہ ہیں اور اس کا باقاعدہ اظہار بھی ان کے اشعار میں دیکھنے کو ملتا ہے

؎سادگی حسن کی شعروں میں بیاں کرنی تھیں
لفظ آسان چُنے، مصرع سادہ باندھا
(چاک سے اترے وجود ص ۱۲)

؎مرے سخن کا سلیقہ بچا گیا مجھ کو
میں آگیا تو عدو پر مِرا بیان کُھلا
(چاک سے اترے وجود ص ۳۵)

شہزاد نوجوان نسل کو بھی تفکر اور تدبر کا درس دینے پر زور دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے اندر بغاوت کے جذبات زندہ رہنے دیئے جائیں۔

؎بجا کہ دہر میں سامانِ انقلاب نہیں
متاعِ جوئے بغاوت تو پاس رہنے دے
اسی سے نسلِ رواں کا شعور مہکے گا
ہوا میں فکرِ تغیر کی باس رہنے دے
(چاک سے اترے وجود ص ۶۳)

خدا سے کلام:

شہزاد نے اپنی شاعری میں قدرت اور خدا سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ خدا اورانسان کے تعلق پر بھی سوال اٹھائے ہیں۔ شہزاد کے ہاں تصوف اور روحانیت کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ ان پر روشنی ڈالتے ہوئے خاں(۱۸) رقمطراز ہیں:

> "شہزاد نیّر کی شاعری روحانیت کی وہ معراج اور کمال ہے کہ جہاں انسان کی روح نورانیت اور پاکیزگی کی انتہا کو چھو لیتی ہے۔ جہاں وہ اپنے پاک رب سے وصال پا لیتی ہے۔ جہاں پہ سنگ ذات اور تمام تر حجاباتِ ذات ہٹ جاتے ہیں جہاں من و تو کے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔"

شہزاد نے اپنی شاعری میں مابعد الطبیعاتی اوار و رموز کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ شہزاد کی سوچ اور تفکر انہیں اس کائنات کی وسعتوں پر غور کرنے اور خدا سے مکالمہ کرنے پر اکساتا ہے اور ان کے لہجے کو ایک خاص جرات رندانہ عطا کرتا ہے۔ شہزاد زندگی کا بس سرسری مطالعہ نہیں کرتے بلکہ زندگی کی اوپری پرت سے بہت اندر تک دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شہزاد خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

ے چلتے پھرتے اسے بندش کا گماں تک نہ رہے
اس نے اِنسان کو اِس درجہ کُشادہ باندھا
(چاک سے اترے وجود ص۱۱)

ایک طرف تو وہ خدا سے شکوہ کناں ہے تو دوسری طرف اس سے التجا کرتے نظر آتے ہیں کہ مجھے چاک سے نہ اُتارنا۔

ے تو بنا کے پھر سے بگاڑ دے، مجھے چاک سے نہ اُتارنا
رہوں کوزہ گر ترے سامنے، مجھے چاک سے نہ اُتارنا
ترا گیلا ہاتھ جو ہٹ گیا مرے بھیگے بھیگے وجود سے

مجھے ڈھانپ لینا ہے آگ نے، مجھے چاک سے نہ اتارنا

(چاک سے اترے وجود ص ۲۵)

تصوف محض مدہوشی اور دنیا سے کٹ جانے کا نام نہیں بلکہ ایک حقیقی صوفی انسانوں کی خوشنودی کی وساطت سے خدا تک پہنچتا ہے۔ وہ اپنی سوچ کو محدود دائرے سے نکال کر کائنات کے وسیع میدان میں لے آتا ہے۔ وہ گیان تک کی طویل اور کٹھن منزل تک پہنچنے کے لیے علم اور عقل کی کئی چوٹیاں سر کرتا ہے۔ وہ حیات و کائنات کی الجھنیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خدا کی ذات کو بھی ایسے ہی تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس تک پہنچنے کے لیے بھی اپنی تلاش کا عمل جاری و ساری رکھتا ہے۔ شہزاد کی شاعری میں موجود تصوف کی گواہی دیتے چند اشعار درج ذیل ہیں:

؎ آخر مجھے سراب نے سیراب کر دیا
میں جو سمندروں سے کبھی تر نہیں ہوا

(خوابشار ص ۱۳۵)

؎ یہی کُھلا کہ مسافر نے خود کو پار کیا
تری تلاش کے صحرا کو پار کرتے ہوئے

(چاک سے اترے وجود ص ۲۰)

؎ اُس کا وجود میرے تصور کا معجزہ
جیسا میں اس کو سوچ لوں ویسا دکھائی دے

(خوابشار ص ۱۲)

؎ میں تو بس دیکھنے نکلا تھا نقوشِ ہستی
چل کے خود پاس مرے حرف و معانی آئے

(خوابشار ص ۱۵)

شہزاد کی غزل کا فنی و اسلوبیاتی جائزہ:

اسلوب کسی مصنف یا شاعر کے لب و لہجے، طرز نگارش اور اندازِ بیاں کا نام ہے۔ ایک ہی بات کو مختلف ذہن اور مختلف اندازِ فکر رکھنے والے لوگ مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں اور یہ خاص اندزا ہی ان کا اسلوب کہلاتا ہے۔ اور یہ اسلوب ہی ایک ادیب یا شاعر کو دوسروں سے ممتاز اور الگ بناتا ہے۔ کسی بھی شاعر کی پہچان اس کے اسلوب سے ہوتی ہے۔ اسلوب کردار یا شخصیت کا عکس ہے، اسلوب ہی کسی شاعر کو ادب میں جداگانہ مقام عطا کرتا ہے۔ اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے عابد (۱۹) لکھتے ہیں۔

> "اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیّز ہو جاتا ہے۔"

شہزاد نیّر دورِ جدید کے نامور غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا اسلوب نہ تو بہت قدیم ہے اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ جدید بلکہ ان کا اسلوب ایک خاص طرح کی سادی، سلاست اور روانی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ شہزاد کا شمار ان غزل گو شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی غزل کا فکری اور فنی رویہ غزل کے کلاسیکل عہد سے لیا اور مستقبل کے دھارے سے بھی وابستہ رہے اس طرح ان کی غزل ماضی اور مستقبل کے ساتھ بیک وقت منسلک ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر حال کی نمائندہ غزل کہلائی۔ گویا شہزاد بیک وقت قدیم شعری روایات کے علمبردار بھی ہیں اور عصری رویوں اور رجحانات کے نمائندے بھی ہیں۔ ان کی غزل میں غزل کی روایت کا جاندار تاثر اور جدید رجحانات کا عرفان ملتا ہے۔ شہزاد کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے اقبال (۲۰) لکھتے ہیں۔

> "میر و غالب کی روایت کے کلاسیکی دھارے سے بعد ازاں جو نو کلاسیکی اسلوبِ غزل تشکیل پایا وہ اسلوبِ بیاں میں ابہام کی نسبت شفافیت کی طرف مائل تھا اور اسلوبِ زباں میں عربی و فارسی لفظیات کے نئے تطہیر شدہ تناسب پر مشتمل تھا۔ فیض و فراز کے ہاں نو کلاسیکی اسلوب کے ان نمایاں پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مضامین کے اعتبار سے غمِ جاناں میں غمِ دوراں کی آمیزش بھی بڑھی۔ شہزاد نیّر نمایاں طور پر اس اسلوبِ غزل کی ایک تخلیقی توسیع ہے۔ صاف شفاف بیان اور نتھرے ستھرے مصرعے شہزاد

نیّر کے اسلوب کے ترجیحی پہلو ہیں۔ کیفیت ہو صورتِ حال ہو مدعا ہو۔ پُراعتماد
لہجے اور پُر آہنگ آواز میں پورے طور پر ادا کرتے ہیں۔"

فکری اور فنی دونوں پہلوؤں سے شہزاد کی غزل اعلی معیارات پر پورا اُترتی ہے انہوں نے فکری پہلوؤں کے ساتھ ساتھ فنی پہلوؤں کو بھی نہایت عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ اپنی غزل میں اپنایا ہے وہ عمدہ تشبیہات اور استعارات کی جمالیاتی معنویت سے بھی خوب واقف ہیں اوران کے ہاں علامتی نظام بھی جذبے کی شدت سے ابھرتا اور خیال کی گہرائی سے سنورتا ہے۔ انہوں نے اپنے لہجے اورآواز کو دوسری آوازوں میں گم نہیں ہونے دیا۔ شہزاد نے طرزِ سخن اردو کی کلاسیکی شاعری سے لیا تو موضوعِ سخن زمانے سے اوراس طرح ان کی شاعری میں قدیم وجدید کا ایک خوب صورت امتزاج دیکھنے کو ملا۔ اسی جداگانہ رنگ و آہنگ کی وجہ سے شہزاد اپنے معاصرین میں منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ شہزاد کی غزل میں روانی اور سلاست ہے اوران کا اندازِبیان، آہنگ، طرزِادا اور الفاظ کا چناؤ دوسروں سے منفرد ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے انہیں دیگر شعراء میں انفرادیت حاصل ہے۔ شہزاد کی غزلوں میں فارسی، عربی اور ہندی زبانوں کے الفاظ کا امتزاج ملتا ہے۔ شہزاد کی شاعری میں اظہار کا جمال اور تازگی اپنی طرف کھینچتا اور متوجہ کرتا ہے۔ انہوں نے ایک طرف کلاسیکیت کا دامن تھاما تو دوسری طرف اپنی شاعری میں تازگی کا ایک الگ انداز واحساس لیے نئے لہجے اور آہنگ کو متعارف کروایا

ان کی غزل کے چند فنی اور اسلوبی پہلوؤں پر صفحاتِ ذیل میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

عمدہ تشبیہات واستعارات:

اردو شاعری اور غزل میں تمام بڑے شعراء نے اپنے کلام کو نمایاں اور منفرد بنانے کے لیے عمدہ اور جان دار تشبیہات اور استعارات کا نہایت خوبی اور مہارت سے استعمال کیا ہے۔ تشبیہ اور استعاہ کسی کلام کو معنویت عطا کرتے ہیں اور ان سے کلام کا معنوی کینوس وسیع ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری کی شان وشوکت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ شہزاد کا کلام بھی ان محاسن سے لبریز ہے اور انہوں نے نت نئی تشبیہات اور استعارات کا نہایت مہارت سے استعمال کیا ہے۔ بھٹی (۲۱) رقمطراز ہیں:

"شہزاد نیّر کی شاعری میں جدید تر شاعری کے سبھی رنگ اپنی جھلک دکھلا رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں استعارے، لفظیات، تشبیہات ان کے اپنے ہوتے ہیں اس لیے ہجوم میں بھی ان کے ترنم کو پہچانا جا سکتا ہے۔ میں اگر اپنے فہم کے مطابق شہزاد نیّر کی نظموں اور غزلوں کو دیکھوں تو شہزاد نیّر نے انہیں اتنی مہارت اور خوبی سے نبھایا ہے کہ وہ ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات میں پیوستہ نظر آتی ہیں۔"

شہزاد کے کلام میں سے تشبیہ کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

؎دل کی سبتک آگ ہوئی، جاں دیپک راگ ہوئی
شعلوں سا اظہار کیا، لہجہ انگار کیا
(چاک سے اترے وجود ص ۱۸)

اس شعر میں شہزاد نے لہجے کو انگاروں اور شعلوں سے تشبیہ دی ہے۔

؎ترا چہرہ ہے یا ماہِ محبت
عجب اک نور سا چھٹکا ہوا ہے
(خوابشار ص ۱۲۴)

اس شعر میں انہوں نے محبوب کے چہرے کو محبت کے چاند سے تشبیہ دی ہے۔

؎کچھ صاف نظر آئے مجھے بارشِ گریہ
آنکھوں سے ذرا پردۂ نم دار اُٹھانا
(خوابشار ص ۱۱۹)

اس شعر میں آنسوؤں کے گرنے کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہیں۔

استعارہ سے مراد وہ لفظ ہے جو اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ تعلق پایا جاتا ہو۔ شہزاد نے اپنی شاعری میں استعارات کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ ہمیں استعارہ اور امیجری کا دلکش امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال درج ذیل ہے۔

تمہارے ہجر کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہی
مِرے بدن کا لرزتا ہوا مکان گرا
اُدھر دعا کو اُٹھائے ہوئے دو ہاتھ گِرے
اِدھر وجود کی کشتی کا بادبان گِرا
(چاک سے اترے وجود ص ۱۴)

نادر اور دلکش تراکیب:

تراکیب سازی کا عمل شاعری میں شروع سے ہی جاری رہا ہے اور نامور شعراء نے مستعمل تراکیب کو برتنے کے ساتھ ساتھ نئی تراکیب وضع کرنے اور رائج کرنے میں ہمیشہ دلچسپی لی ہے۔ شاعر اپنے تصورات و خیالات کو تمام تر معنویت کے ساتھ قاری کے دل و دماغ پر ثبت کرنے کے لیے تراکیب کا استعمال کرتا ہے۔ شہزاد نے اپنی شاعری میں ایسی نادر اور اچھوتی تراکیب پیش کی ہیں جن پر بیک وقت حیرت اور فخر کا اظہار کیا جا سکتا ہے الفاظ اور تراکیب کے انتخاب میں شہزاد کو ید طولیٰ حاصل ہے اور وہ بات کو زیادہ بامعنی اور پُر اثر بنانے کے لیے ایسی دلکش تراکیب ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہ بے ساختہ ان کی فنی مہارت کو داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ شہزاد نے اپنی شاعری میں رشکِ ریشہ گل، چوبِ چاک، آب و گل، سنگِ چاک، حرص زر و سیم، جمِ اسیر انِ جفا، نالۂ دل، سوزنِ درد، حسنِ ہجر یاب، وجود کی کشتی کا بادبان، عذابِ منتِ افلاک، جامۂ صد چاک، کربِ عذابِ شکست ذات، حسنِ جفا کش، سیر قریۂ پندار، فنائے دل کی گڈری، جیسی تراکیب متعارف کروائی ہیں۔ یہ تراکیب اپنے اندر وسیع معانی لیے ہوئے ہیں اور نہ صرف ظاہری طور پر انفرادیت کی حامل ہیں بلکہ معنوی ابلاغ کے حوالے سے بھی مالا مال ہیں۔ اشعار درج ذیل ہیں۔

؎موجۂ سیلابِ غم،عزمِ جوانی لے گیا
آنکھ میں جو خواب تھے نمکین پانی لے گیا
(چاک سے اترے وجود ص۱۵)

؎پانی پہ بنا رکھنا خس و خارِ گماں کی
پھر تا بہ فلک وہم کی دیوار اُٹھانا
(خوابشار ص۱۱۸)

؎میانِ سیلِ رقیباں،مِرا نشان کُھلا
ہوا خلاف سے آئی تو بادبان کُھلا

(چاک سے اترے وجود ص۳۴)

صنعتِ تضاد اور تکرار کا استعمال:

شاعری میں الفاظ کی صوتی اور معنوی مطابقت کے ساتھ ساتھ تضاد و تقابل اور تکرار کی مطابقتیں بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں تضاد و تقابل اور تکرار کی یہ مطابقتیں اشعار میں غیر معمولی تنظیم پیدا کرتی ہیں اوران کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔ ادبی اعتبار سے تضاد کلام کا ایسا حسن ہے جو متضاد الفاظ کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے اور اس سے شاعری میں بڑی دلچسپ اور معنی خیز صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ شہزاد نے اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر تضاد، تکرار اور مناسبت کا باخوبی استعمال کیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

؎یاد جب آئے وہ جاتے ہوئے رکنا تیرا
ایک دم درد کے دریا میں روانی آئے
(خوابشار ص۱۶)

اس شعر میں "آئے" اور "جاتے" کا تضاد "رکنا" اور "روانی" کا تضاد قابل توجہ اور قابل کشش ہے جس نے شعر کی خوبصورتی میں بہت اضافہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر میں "آنے" اور "جانے" کی تکراری نسبت

بھی موجود ہے اور پورے مصرع میں صوت "د" کی چار بار تکرار شعر کی خوبصورتی اور معنوی ابلاغ میں چار چاند لگا رہی ہے۔

؎آج تک درگزر سے کام لیا
اب ترا سامنا ضروری ہے
(خوابشار ص ۳۱)

اس شعر میں " درگزر" کے بنیادی معنی کا "سامنا" سے تضاد ہے کہ یہاں درگزر رکنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

؎فلک نشین تو زوروں سے کھینچتا تھا مجھے
میں خود ہی گرتا گراتا زمیں پہ آن گِرا
(چاک سے اترے وجود ص ۱۴)

اس ذو معنی شعر میں "فلک" اور "زمین" کا تضاد موجود ہے۔

؎سرِبزمِ جہاں سب ہنس رہے ہیں
تماشا ہو گیا رونا ہمارا
(چاک سے اترے وجود ص ۴۱)

اس شعر میں "ہنسنا" اور "رونا" کا تضاد قابل توجہ ہے۔

؎جنگلوں جنگلوں آواز لگاتا ہے کوئی
جال ہونے سے تو بہتر ہے پرندہ ہونا
(خوابشار ص ۱۴۱)

اس شعر میں جنگلوں جنگلوں کی لفظی تکرار شعر کی خوبصورتی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جبکہ مندرجہ ذیل شعر میں قدم قدم کی تکرار اس کی رعنائی بڑھا رہی ہے۔

؎قدم قدم وہ دھمک ہو،زمیں دھڑک جائے
فلک غبار میں آئےتوعشق ہو جائے
(خوابشار ص ۶۲)

موسیقیت:

ترنم اور موسیقیت شہزاد کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ان کی شاعری میں ایک صوتی آہنگ موجود ہے اور الفاظ کے انتخاب میں بڑی فنکاری کا ثبوت دیا ہے جس سے ان کے کلام میں ایک موسیقیت اور نغمگی پیدا ہو گی ہے جو پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔وہ منفرد الفاظ کی نغمگی اور موسیقیت کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور انہوں نے تجربات کے اظہار کے لیے موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب کر کے بڑے فنکارانہ شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔غزل کے ردیف اور قافیوں کی تلاش میں شہزاد کو کمال کا عبور حاصل ہے۔شہزاد کی شاعری میں موجود اظہار کا جمال اور خیال کی تازگی قابلِ توجہ ہیں۔چند اشعار درج ذیل ہیں:

؎ہجر کی پہلی شام پڑے دو بھاری کام پڑے
اُس کو بھی تیار کیا،دِل بھی تیار کیا
قطرہ قطرہ جھیل بنیں پھر آنکھیں نیل بنیں
مُجھ کو بہتی دھار کیا،ساون کی تار کیا
(چاک سے اترے وجود ص ۱۸)

؎میں ذرّہ رُلتے کنکر کا،وہ چاند چمکتے امبر کا
میں دھول رمائے رکھتا ہوں وہ روپ سجائے رکھتا ہے
اک ہجر کا مارا بےچارا،دلدار ملن کا متوارا

گھپ رات کے گہرے جنگل میں دو نین جگائے رکھتا ہے

(خوابشار ص ۱۲۳)

بحور کا تنوّع:

شہزاد کی شاعری میں موجود بحور کا تنوّع متاثر کن اور حیران کن ہے۔ انہوں نے بڑی اور چھوٹی دونوں بحور میں کامیابی سے غزلیں کہی ہیں۔ چھوٹی بحر میں ارکان کی تعداد کم ہوتی ہے اور بات کا سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انتہائی مختصر الفاظ میں بات کرنا فصاحت و بلاغت کی نشانی ہے اور شہزاد نے چھوٹی بحر میں غزلیں کہہ کر اپنی فنی مہارت اور پختگی کا عمدگی سے اظہار کیا ہے۔ چند اشعار درج زیل ہیں؛

ایسی گہرائی، یہ اُچھال نہیں
دیکھ دریا مری مثال نہیں

(خوابشار ص ۱۱۴)

ہزاروں ٹھوکروں کی داستاں ہے
کہیں اِک راستہ ہموار ہونا

(چاک سے اترے وجود ص ۱۸۰)

یہ ہے دنیا، یہ محبت ہے دھری
کون سا رنج اُٹھانا ہے مجھے

(خوابشار ص ۱۳۲)

بڑی مشکل سے میں مرہم ہوا ہوں
بہت آسان تھا تلوار ہونا

(چاک سے اترے وجود ص ۸۲)

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شہزاد کم الفاظ میں بڑے سے بڑے موضوع کو سمو دینے کی مکمل اہلیت رکھتے ہیں اوران کو اس نازک فن پر مکمل عبور حاصل ہے۔ شہزاد جس طرح چھوٹی بحروں میں اشعار موزوں کر سکتے ہیں اس طرح طویل بحریں بھی ان کی دسترس میں ہیں اور طویل بحروں میں لکھی گئی شہزاد کی غزلیں معنویت، صوری حسن اور رعنائی خیال میں کسی طور بھی چھوٹی بحر کی غزلوں سے کم نہیں۔ شہزاد کی شاعری جگہ جگہ اس بات کا واضح اظہار کرتی نظر آتی ہے کہ ان کے پاس خیالات واظہار کے بہت سے خزانے موجود ہیں اور نہ ہی ان کے پاس ذخیرہ الفاظ کی کمی ہے۔ وہ الفاظ کے ان خزینوں سے اشعار کی صورت میں اعلیٰ نگینے تیار کرتے رہتے ہیں۔ چند اشعار زیرِ مطالعہ ہیں۔

؎ تری اُنگلیاں مرے جسم میں یونہی لمس بن کے گڑی رہیں
کفِ کوزہ گر مری مان لے مجھے چاک سے نہ اُتارنا
(چاک سے اترے وجود ص ۲۵)

؎ وہ پیڑ پرانے آنگن کا، وہ پھول کسی کے گلشن کا
دن رات سلگتی سانسوں میں خوشبو سی رچائے رکھتا ہے
(خوابشار ص ۱۲۳)

؎ مرے کوچہ گرد نے لَوٹ کر مرے دل پہ اشک گرا دیا
اُسے ایک پل نے مٹا دیا جو حساب تھا مہ و سال کا
(چاک سے اترے وجود ص ۵۴)

غرض کہ شہزاد نے تشبیہ، استعارہ، تراکیب، تضاد، بحور کو اس خوبی کے ساتھ شعر کیا ہے کہ نہ صرف غزل کا حسن آراستہ ہوا بلکہ ان کے معنوی ابلاغ کی ترسیل بھی آسان ہو گئی۔ شہزاد کا کلام مندرجہ بالا خوبیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی فکری اور فنی خوبیوں سے مالامال ہے مگر یہاں اختصار کے پیش نظر ان سب کو ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

شہزاد کا شعری مقام و مرتبہ:

گوجرانوالہ کی شعری روایت اور شہزاد نیّر کی زندگی، شاعری اور فکر و فن پر گذشتہ ابواب میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے اور شہزاد کی شخصیت اور شاعری کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا گیا ہے اور نہایت وسعت کے ساتھ ان پر تحقیق و تنقید کی گئی ہے۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شہزاد کا شعری مقام و مرتبہ کیا ہے؟

یہ بات ہم جانتے ہیں کہ شہزاد کا بچپن سے ہی رجحان شعر و شاعری کی طرف تھا اور انہوں نے ساتویں جماعت سے ہی لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ کالج میں آئے تو یہ ادبی ذوق و شوق اور پروان چڑھا اور انہوں نے مختلف ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بہت سی ادبی محفلوں کا حصہ بننے لگے۔ فوج کی مشکل اور کٹھن ملازمت کے دوران بھی وہ لکھتے رہے اور مطالعہ کی طرف ان کا رجحان غالب رہا۔ پہلا شعری مجموعہ "برفاب" تھا جسے بہت زیادہ پذیرائی ملی اور تمام ادبی حلقوں میں ان کی شاعری کا بھرپور خیر مقدم کیا گیا۔ اپنے پہلے شعری مجموعہ سے ہی شہزاد ادب کی دنیا میں پہچانے جانے لگے۔

قریشی (۲۲) لکھتے ہیں:

> "ذات کا اندر سے باہر کی طرف سفر، حسی تجربوں سے اکتساب فن کے نتیجے میں حرف کا لفظ اور پھر تخلیقیت تک کا سفر اپنا آسان نہیں عمریں لگ جاتی ہیں تب کہیں پہچان کے سکے پر ملکیت کی مہر ثبت ہوتی ہے- اپنے داامن میں اصحاب کہف کا سا تامل لئے کہ وقت کے بازار میں یہ سکہ نا قابل قبول نہ ہو، نیند سے جاگنے کا عمل طوالت پر مائل ہے۔ ایسے میں وہ لوگ واقعی قابل ستائش اور لائق صد تحسین ہیں جو ابتدا سے ہی قبولیت کی سند و اعترافِ فن ہمرا لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شک آنست کہ خوبیود، نہ کے عطار بگوید اپنی نظموں اور غزلوں میں وجدانی بصیرت، تجربی معرفت اور مشاہداتی وسعت لئے ایسے محدودے فنکاروں کی محفل میں اپنی پہچان کی دستار سر پر سجائے مجھے شہزاد نیّر ایک نمایاں مقام پر بیٹھا نظر آتا ہے۔"

موجودہ شاعری کو شہزاد کی بہترین عطا یہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی کے مسائل اور عام موضوعات کو حسن و خوبی کے ساتھ نظم کرنے کہ ساتھ ساتھ انہوں نے ایک فوجی کو درپیش مشکلات اور حالات کو بھی صفحہ قرطاس پر منتقل کیاہے اور عسکری زندگی کے کئی نادیدہ پہلو ہمارے سامنے لائے ہیں۔اپنے ذاتی جذبات و تجربات کو ہر انسان کی کہانی بنادینا اور انہیں اجتماعی رنگ میں پیش کرنا شہزاد کا خاص کارنامہ ہے اور یہی چیز انہیں ہم عصر شاعروں میں ممتاز کرتی ہے۔

شدید حساس دل اور فکرو دانائی سے لبریز ذہن اور دماغ یہ دو ایسی خوبیاں ہیں جو شہزاد میں پورے کمال کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور انہوں نے ان دو خوبیوں کو اپنی شاعری میں بڑے عمدہ انداز میں برتا بھی ہے یہی ہے کے ان کی شاعری ہمارے انفرادی اور اجتماعی احساس و کرب کی آئینہ دار بن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔ ہمیں شہزاد کی شاعری کے آئینے میں اپنی ذات اور اپنے معاشرے کی تصویر باخوبی نظر آتی ہے اس لئے اہم کہ سکتے ہیں کہ شہزادہ نے اپنے کلام سے جدید طرزِ احساس کی تشکیل میں نمایاں حد تک حصہ لیاہے۔

شمارہ تارکین وطن میں شہزاد کے فن کا تعارف پیش کرتے ہوئے پ۔ا۔ن (۲۳) لکھتی ہیں

> "شہزاد نیّر پیشے کے لحاظ سے عسکری ہیں اور وہ سیاچن کی بلندیوں پر برف زاروں میں اپنے فرائض منصبی انجام دے چکے ہیں–انہوں نے اس حوالے سے جو نظمیں کہی ہیں وہ ان کے پہلے نظموں میں برفاب میں شامل ہیں۔ ان کا شعری تجربہ خاصے عمیق تجربات ومشاہدات کا حامل ہے۔انہوں نے اپنی روایتی نظموں میں شعر برائے شعر نہیں کہاہے اور نہ ہی انہوں نے روایتی قافیہ پیمائی کا اندازہ کیاہے بلکہ انہوں نے اپنے فرائض اور فنِ شعر دونوں کے خوبصورت امتزاج کو اپنے شعور کی بھٹی میں ڈال کر کندں کو سونابنا کر اگلاہے ان کے انداز نگارش سے معلوم ہوتاہے کہ وہ خاصے کہنہ مشق شاعر ہیں۔"

شہزاد کی شاعری میں ایک میٹھا سا رچاؤ ہے کو ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جو تشبیہات، استعارات، رموزوعلائم اور الفاظ استعمال کیے ہیں وہ سادگی اور تاثیر سے بھرپور ہیں۔ ان کے کلام میں ایک عجیب رنگارنگی اور بوقلمونی پائی جاتی ہے اور ان کی شاعری دل کے ساتھ ساتھ دماغ کی کھڑکیوں کو

بھی وا کرتی ہے۔ان کی شاعری اور موضوعات دونوں میں ایک نیاپن اور تازگی موجود ہے اور یہ شاعرانہ تازگی ہی انہیں ایک بڑا شاعر بناتی ہے اور ان کے بلند تخیل اور ذہنی اُڑان کا پتا دیتی ہے۔شہزاد ایسے شاعر ہیں کہ تمام دوست، دشمن ان کے فن کے معترف نظر آتے ہیں اور شہزاد سب سے ہی دل کھول کر داد وصول کرتے ہیں۔وہ محبتوں کی فضاؤں کے اسیر ہیں اور محبت ہی اس فن میں ان کی بہترین زادِراہ ہے۔وہ الفاظ سے لے کر انداز، مضامین اور اسلوب تک ہر جگہ اپنی انفرادیت کی حفاظت کرتے نظر آتے ہیں۔

آثم کھیازئی(۲۴)لکھتے ہیں:

> "شہزاد نیّر صاحب کو پڑھ کر کائنات کا حسن و لطافت ایک حسین کہکشاں بن کر سامنے آتا ہے۔الفاظ کے حسین جھرمٹ میں شہزاد نیّر صاحب نے محبت اور امن کے ساتھ ساتھ انقلاب، تصوف، جدید ادبی اور علمی استعارات کی لے سے لہجوں کو لوچ کا پیراہن پہنا کر اپنا منفرد اسلوب اور اندازِ بیان قائم کر کے اپنی پہچان اور انفرادیت برقرار رکھی۔شہزاد نیّر نے اپنے ہم عصر شعراء میں کسی کا اثر قطعی قبول نہیں کیا اور نہ ہی اپنے سے پہلے شعراء کی نقالی کا سہارا لیکر خانہ پری کرنے کی سعی کی ہے۔شہزاد نیّر صاحب پاک آرمی میں میجر کے عہدے پر فائز ہیں۔اس لیے ان کی شاعری میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔وہ سیدھے سادے مگر کھرّے اور سچے انداز میں اپنے اشعار میں اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔"

شہزاد کا کلام ان کی فنی مہارت اور وسیع علمی عرفان کا آئینہ دار ہے۔انہوں نے نامانوس اور جدید الفاظ کا استعمال کر کے اپنی شاعری کو کنجلگ بتانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے الفاظ کی تازگی سے شعر و سخن میں ایسے پھول کھلائے ہیں جو خوشبو میں عطر کی مہک کو شرماتے ہیں اور جن میں دھنک کے ساتوں رنگ شامل ہیں۔شہزاد کی شاعری کا مسلک محبت ہے اور وہ محبتوں کے امین اور سچائی کے علمبردار ہیں۔شہزاد اپنی شاعری میں محبت اور امن کا درس دیتے ہوئے انسان کو اس کے اصل مقام سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔آج کا انسان جو تفکر سے بہت دور ہو گیا ہے اور غلاموں کی طرح اپنے روزانہ کے معمولات کو جاری رکھے ہوئے ہے، جو سوال کرنا نہیں جانتا اس انسان

کے لئے شہزاد کی شاعری میں بہت سے پیغام چھپے ہوئے ہیں۔ شہزاد جب معاشرے میں ہونے والے مظالم اور اجتماعی نفسا نفسی کے ساتھ ساتھ سے بے حسی کے جذبے کو پروان چڑھتے تو ان کا قلم آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔

شہزاد کی شعری کتھا ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہماری تہذیب اور لخت لخت ہوتے انسان کی کہانی ہے۔ یہ آج کے اجتماعی ماحول کا المیہ بھی ہے اور اس ماحول کے ہاتھوں مجبور رویے کسی انسان کے داخلی اور باطنی آشوب کی داستان بھی ہے۔ ایک ایسا انسان جو اپنے خوابوں کے سنہری پنجرے میں گرفتار ہے اور جو حال وماضی کو بے یقینی سے دیکھ رہا ہے۔ ایسے انسان کے لئے شہزاد کی شاعری آئینے کا سا کام کرتی ہے۔ جو ہر چیز کو سچائی اور منعکس کر کے دکھائی دیتا ہے۔

موجود ادب میں لطافت احساس تخیل کی بلند پرواز کی بہترین مثال شہزاد کا کلام ہے۔ شہزاد کی شاعری کی شاعری کسی فراری رویے اور ذہنی تعیش کے باعث وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کی شاعری میں ہر طرف زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ زندگی کے ان تلخ وشیریں تجربات کو شہزاد نے خلوص کی صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شہزاد ایک صاحب فکر، وسیع ومشرب اور کثیر الاحباب کے انسان ہیں اور انہوں نے زندگی کے سبھی واقعات کا بڑے منطقی انداز میں جائزہ لیا ہے اور زندگی کے میدان میں انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ ان مختلف النواع حالات وتجربات نے ان کے کلام میں تنوع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ خوبیوں کو بھی خوب چمکایا ہے اس طرح اردو شاعری کے جدید منظر نامہ پر ایک ایسا شاعر ابھرتا دکھائی دیتا ہے جس کا کام لفظی بازی گری نہیں بلکہ آئینہ حیات ہے۔ ایک ایسا آئینہ حیات جس میں انسانی زندگی کے مختلف عکس باآسانی دیکھے جاسکتے ہیں

بھٹی (۲۱) لکھتے ہیں:

> "شہزاد نیّر کی کی شاعری مسلسل نئے پن کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ وہ معاشرے کی چیرہ دستیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ارد گرد بکھری کہانیوں کو شعری پیکر عطا کرنے مصروف ہیں۔"

مسلسل شاعرانہ محنت اور فکری و فنی غور و فکر نے شہزاد کے کلام میں ایسی تاثیر ڈال دی ہے اور انہیں بڑے اور نامور شعراء کا سا مقام عنائت کیا ہے۔ مستقبل کا مورخ جب بھی اردو ادب کی تاریخ لکھے گا شہزاد کی ادب کے لیے کی گئی کاوشوں اور خدمت کا ضرور تذکرہ کرے گا۔ شہزاد کے کلام اور فن میں فکر و عمل اور جذبات و خیالات کا ایک عمدہ توازن اور تناسب پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں فرسودہ قدروں سے ہمیشہ دامن بچانے میں اور جدت کی طلب و تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ شہزاد کی شاعری میں مکمل صدق و خلوص ہے اور ان کے کلام میں اکثر مقامات پر ایک نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری وقت کی عام ڈگر کے مطابق صرف الفاظ کا خوب صورت بیان نہیں بلکہ اس میں ایک خاص انفرادیت ہے جو اردو کے بڑے شعراء میں پائی جاتی ہے۔ اپنے خلوص اور جذبے کے ساتھ شہزاد نئی نسل کے ایک نمائندہ شاعر ہیں۔

قاسمی (۲۵) لکھتے ہیں:

> "شہزاد نیّر نوجوان شاعر ہیں مگر جوانی میں ہی انہوں نے اپنی تخلیق توانائیوں کا لوہا منوا ہے۔ وہ دونوں اُصنافِ شعر، نظم اور غزل کو سلیقے سے برتتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا جوہر پیشتر ان کی نظموں میں کھلتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کی صورت حال کا مطالعہ بہت ذہانت و ذکاوت کے ساتھ کرتے ہیں اور ر اس مطالعے کے فن کارانہ اظہار میں کو ئی بھی مصلحت، ان کے مزاحم نہیں ہوتی چنانچہ ان کی شاعری کا نمایاں تاثر بھی یقیناً دیکھتے ہیں مگر ان خوابوں کو بھی ماورائیت کو سمندر میں ڈوبنے سے بچائے رکھتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔"

ان کی شاعری میں جہاں رومانوی رنگ پایا جاتا ہے وہیں وہ معاشرے کے پیچیدہ مسائل کو بھی بڑی ذمہ داری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ شہزاد کی شاعری موجودہ دور کے سبھی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ شعری زبان مترنم اور میٹھا لہجہ اور بے ساختگی ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ انہیں بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہوئے شہزاد کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ناقد (۲۶) لکھتے ہیں:

"شہزاد نیّر ندرت آمیز شعری طبع کے امین ہیں جدید طرز فکر اور فنی بلوغت اُن کے کلام سے آشکار ہے ان کے فکری وفنی گوشوں کی سیر کے دوران کہیں بھی دلچسپی کا دامن میلا نہیں ہوا اور نا ہی چھوٹنے پایا ہے۔"

ادبی دنیا میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک شاعر یا ادیب کی تمام تخلیقات ایک ہی رنگ میں لکھتی جاتی ہیں اور تقریباً تمام تخلیقات کا اسلوب اور ان کے موضوع ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی معاملہ اس کی اُلٹ صورت بھی اختیار کر سکتا ہے اور دنیا کے ادب کے آسمان پر بعض ایسے جگمگاتے ستارے طلوع ہوتے ہیں جن کی پر تخلیق ایک نئے رنگ واسلوب کے ساتھ اپنی مخصوص انفرادیت رکھتی ہے اور یہی یہ خوبی ہے جو کسی بھی تخلیق کو تادیر زندہ رکھ سکتی ہے۔ مختلف نوعیت کی تخلیقات پیش کرتے ہوئے شہزاد کے شعری خزانے میں ہر نوع کے ہیرے جواہرات جمع ہو گئے ہیں جو ان کی ثروت سخن میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں الگ ادب کی دنیا میں ایک نمایاں مقام بھی دلاتے ہیں۔ شہزاد نیّر ایک مجسم شاعر ہیں جو سر تا پا محبتوں کی نرم اور پر خلوص نرماہٹوں سے سجایا گیا ہے۔

سحر (۲۷) لکھتی ہیں

"شہزاد نیّر کا شمار ہمارے عہد کے سنجیدہ شاعروں میں ہوتا ہے۔۔۔ غزل، نظم، نثر، گیت، تنقید۔۔۔ انہوں نے تمام اصنافِ سخن میں نمایاں کام کیا ہے۔ پاکستان میں جدید غزل اور نظم کی تاریخ اُن کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔"

شہزاد کی شاعری بنت میں جہاں ایک طرف خوب صورت اور کومل جذبات شامل ہیں وہیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے اشعار کی تہ میں سلگتے ہوئے شرارے بھی رکھ دیئے ہیں۔ ان میں دھیما پن بھی ہے اور سلگاتی ہوئی کیفیت موجود ہے، جدت ہے اور ملائمت بھی ہے۔ انہوں نے جلتے ہوئے سانس کاٹے ہیں اور دکھ کے بگولوں میں سانس لیتے ہوئے وہ اپنے جذبوں کی تفہیم کے ساتھ ساتھ ان کی تجسیم بھی کرتے ہیں۔ ان سب خصوصیات نے شہزاد کے کلام میں ایک رنگارنگی اور بوقلمونی پیدا کر دی ہے۔

بابر (۲۸) لکھتے ہیں:

"شہزاد نیّر کی شاعری کی خاص بات سوچ کی پختگی اور خیال گہرائی ہے، کوئی ایک مصرعہ

بھی کاغذ کا پیٹ بھرنے کی غرض سے نہیں لکھا گیا، مقصدیت سے بھرپور شاعری سطر سطر جھنجھوڑتی نظر آتی ہے، ان میں کچرا چنتے بچوں کا دکھ ہے تو بوجھ ڈھوتے بوڑھے کاندھے بھی ہیں، ملبے تلے دبے پھول ہیں تو زمان و مکان کا فلسفہ بھی ہے۔"

شہزاد کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے عام سی باتوں کو اپنا جمالیاتی تجربہ بناتے ہوئے اس تجربے کا خوش نما اور رنگین عکس کرنوں کی صورت میں اپنی شاعری میں بکھیر دیا ہے۔ شہزاد کی شاعری ارضی ہے آسمانی نہیں۔ عام انسانوں کے شعور میں اُتر کر ان کی حیات کو محسوس کر کے اپنے فکر و فن کا حصہ بنالینا شہزاد کے لئے بائیں ہاتھ کا کام ہے اور اعلیٰ درجے کی تخلیقی صلاحیت اور بصیرت انہیں وافر مقدار میں قدرت کی طرف سے ودیعت کر دی گئی ہیں۔ ان کی شاعری ارضی زندگی کے کسی ایک مخصوص پہلو کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ ہر چیز اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر ایک خاص نظریے کے تحت نظر ڈالتی ہے۔ شہزاد نے زندگی کو اس کے تمام تر لوازمات اور متعلقات کے ہم راہ دیکھا ہے اور جس طرح انہیں دیکھا ہے اسی سچائی اور خوبی کے ساتھ اپنے اور فن اور شاعری کا حصہ بنالیا ہے اور یوں ان کے کلام میں ہمیں جامعیت کی ایک عمدہ شان دیکھنے کو ملتی ہے۔

سحر (۱۵) لکھتی ہیں

""چاک سے اُترے وجود" شہزاد نیّر کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جس کے مطالعے کے بعد انسان خود کو ایک حیرت بھری فضا میں محسوس کرتا ہے۔ اس فضا میں حقیقت ٹھوس اور مجرد نہیں بلکہ کیفیاتی ہے۔ اس دنیا میں دھند کے سائے اور ہیولے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جیسے دیکھا نہیں صرف محسوس کرتا ہے۔ اس فضا میں حقیقت ٹھوس اور مجرد نہیں بلکہ کیفیاتی ہے۔ اس دنیا میں دھند کے سائے اور ہیولے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جسے دیکھا نہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے اور جس میں اس نامعلوم دنیا کو خوبصورت و دلکش شاعرانہ تمثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ آپ نے زندگی کے ان زاویوں اور رنگوں کو اردو کے شعری کینوس پر اجاگر کیا ہے جو اجتماعی و انفرادی سطح پر اس خطہ کی تہذیب و ثقافت میں موجود تو ہیں لیکن اکثر لکھنے والوں کی گرفت میں نہیں۔ شہزاد نیّر کا فنی و تخلیقی اور فکری و حسیّاتی افق بے گراں وسعتوں کا حامل ہے۔"

شہزاد کی شاعری میں ایک کیف آور اور فرحت افزا ترنم بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے اور انہوں نے نادر تشبیہات اور تراکیب کو نہایت خوبی کے ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ شہزاد کے کلام میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ ان کی اصنافِ سخن جن میں انہوں نے اظہارِ خیال کیا ہے بہت سی ہیں اور وہ ایک ورسٹائل ادبی فنکار کی نمایاں حیثیت سے اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں اور اگر جدیدیت کے پہلو اور حوالے سے ہم شہزاد کی شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں قدم قدم پر ایک خوش گوار حیرت کا سامنا ہوتا ہے۔ شہزاد کی نظموں سے لے کر غزلوں اور طویل نظموں تک ہر مقام پر جدت و جدیدیت پہلو بہ پہلو چلتی نظر آتی ہیں۔ کبھی وہ شاعری کے ذریعے اپنی دلی کیفیات کو بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف ملک سے محبت کا دم بھرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں وہ فلسفہ و فکر کو موضوع شعر کرتے ہیں تو کہیں انسان سے عقیدت و محبت کا والہانہ اظہار کرتے ہیں۔ غرض کہ شہزاد کے کلام میں ہر طرف جدیدیت کے نوع بہ نوع رنگ نظر آتے ہیں۔ لیکن شہزاد شعر وادب میں جدیدیت کے علم بردار ہونے کے ساتھ ساتھ تغزلِ شعری کے بھی مشعل بردار ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں ہمیں حسن کاری اور تازہ کاری دونوں کا رچاؤ اور سنگم نظر آتا ہے۔ شہزاد کی شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ وہ ایک خوش فکر اور خوش خیال شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں زیبائی فکر کے ساتھ ساتھ تغزل کی رعنائی بھی اپنے جلوے بکھیرتی ہے۔ شعری تغزل سے ہی شاعر کے کلام میں دلکشی اور انفرادیت پیدا ہوتی ہے اور وہ کلام پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دل و دماغ پر ایک منفرد سا تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ٹھہرتا ہے۔ گویا شہزاد کی شاعری صرف شاعر نہیں بلکہ رنگوں بھری ایک تخلیقی کائنات ہے جو پڑھنے والوں کے لیے راحت و خوشی کے ڈھیروں سامان لیے ہوئے ہے۔ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے طریر (۲۹) رقمطراز ہیں:

> "آج کل بیش تر نظم گو اپنی نظم کے معنوی اور صوتی دائرے کو شعوری طور پر نامکمل رکھتے ہیں۔ لیکن شہزاد کا رویہ مختلف ہے اس نے کوشش کی ہے نظم اپنی تکمیلیت کا احساس دلائے اور مجھے وہ اس کوشش میں کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ لسانی سطح پر بھی اس نے نئی نظم کی بے اعتدالیوں سے بچ کر چلنے کی کوشش کی ہے۔ علم سے وابستگی، فن سے لگاؤ، گردوپیش سے جڑت، خدا سے مکالمہ، تبصرے کی بجائے تجزیے کی کوشش، سطر بندی کا شعور، معتدل اضطراب، جراتِ اظہار اور صداقت اس کی ایسی خوبیاں ہیں جو اسے ہمہ وقت آگے بڑھنے پر مجبور کرتی رہیں گی۔"

شہزاد اردو شعر وادب میں جدیدیت کے استعارے بن کر اُبھرے ہیں اور موجودہ شعراء میں انہوں نے اپنی مسلسل جدوجہد اور فنکارانہ مہارت سے اپنی انفرادیت کو ظاہر کیا اور منوایا ہے۔ ادب کے بہت سے اہم اور معروف ناقدین نے شہزاد کے فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے اور ادب کے لیے ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ نیّر کا شمار دورِ حاضر کے ان معتبر شعراء میں کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے وسیع تر فہم وادراک سے اپنے رستے کا تعین کیا اور پھر خلوص اور محبت کے ساتھ سچائی کو اپنا رازداں بناتے ہوئے اس رستے پر قدم رکھ دیا اور اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ شہزاد بلاشبہ اس عہد کے ایک بڑے تخلیق کار ہیں اوران کی شاعری ان کے ماہیرانہ پیرائیہ اظہار کی زندہ وجاوید مثال ہے۔ ان کی مرصع غزلیات اور رس بھری نظمیں قاری کو دل وجان سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ شہزاد روایت کی زمین پر پیر جما کر جدت کا آسمان رنگتے نظر آتے ہیں اوراسی وجہ سے جدید آہنگ اور جدید الفاظ ہونے کے باوجود ان کے کلام میں اوپراپن نہیں آتا۔ ان کی شاعری قاری اور سامعین کو مصرع بہ مصرع اپنی اعجاز بیانی، برجستگی اور فلسفیانہ فکر و فن سے لطف اُٹھانے کا پورا موقع فراہم کرتی ہے۔ شہزاد خوبصورت خیالات کے حامل ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری محبت اور خلوص کے سارے موسموں سے جڑی ہوئی ہے۔ راؤ(۱۳) شہزاد کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تخلیق، تخلیق کار کی ذات اور اس کی شخصیت کی پرتیں کھولنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کی روح کے اعمال نامے اور قلبی واردات کا اظہار حرفوں اور لفظوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس اعمال نامے اور قلبی واردات تک رسائی کے لیے تخلیق کار سے مکالمہ ضروری ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ تخلیق کار کو سامنے بیٹھا کر نہیں بلکہ اس کی تخلیق کے روبرو بیٹھ کر ہوتا ہے، جہاں لفظ ہم کلام ہوتے ہیں، علامتیں اور تمثالیں خود بخود کھلتی ہیں اوران میں پوشیدہ کہانیاں رینگتی ہوئی قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ علمی و ادبی اعتبار سے شہزاد نیّر متنوع خصوصیات کی حامل شخصیت ہیں۔ انہوں نے رپورتاژ، مضمون نویسی اور لسانیات جیسے شعبوں میں بھی اپنی علمی اور ادبی بصیرت کا لوہا منوایا ہے۔ ان کا قلم تازہ فکری جولانیوں اور حیرانیوں کو سمیٹ کر روانیوں کی لاثانی تصویریں بناتا ہے اور شاعری کی دیوی ان پر سایہ فگن ہو کر ان سے شعر لکھواتی ہے اور اسی طرح یہ شاعری آمد کی شاعری کا بہترین نمونہ قرار پاتی ہے۔"

ادب خلا میں تخلیق نہیں پاتا اور نہ ہی یہ خلا کے لوگوں کے لیے تخلیق ہوتا ہے۔ادب ایک زمینی چیز ہے اور زمین والوں کے لیے ہی تخلیق کیا جاتا ہے اور اس میں تمام زمینی عناصر کو شامل کر دیا جاتا ہے۔شہزاد کی شاعری میں بشری دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں اور اسے پڑھ کر یہ اندازہ با آسانی ہو جاتا ہے کہ یہ خلا میں نہیں لکھی گئی بلکہ ایک حسّاس شخص نے دوسروں کی حساسیت بیدار کرنے کے لیے کی ہے۔شہزاد ادیبوں اور شعراء کے اس قافلے سے تعلق رکھتے ہیں جو ازل سے عظمتِ آدم کا پرچم بلند کیے چلے تھے اور جن کی منزل دور ابد تک ہے۔شہزاد کی غزلیں ہوں یا نظمیں ان کی قادرالکلامی کا واضح ثبوت پیش کرتی ہیں۔وہ کہیں مسئلہ جبر و قدر چھیڑ رہے ہیں تو کہیں انسانی تاریخ کا نوحہ رقم کرتے نظر آتے ہیں، کہیں شاعری کے ذریعے انسانی محبت کا دم بھرتے نظر آتے ہیں تو کہیں عشق و عاشقی کے معاملات کو چھیڑ رہے ہیں۔ان کی شاعری نوع بہ نوع رنگوں سے مزین ہے۔مختصراً یہ کہ شہزاد موجودہ دور کے ایک اہم اور قابلِ توجہ شاعر ہیں اور ان کے ہاں موجود فنکارانہ طرزِ تخیل سے لے کر احساس و کرب، ندرتِ فکر، انداز بیاں اور مقاصدِ سخن سب ہی اعلیٰ وارفع ہیں اور ان کا مختلف رنگوں سے مزین اور تیار شدہ تخلیقی کلام دل و دماغ کے لیے روح پرور اور تسلی بخش ہے۔ان کے خیالات جتنے عمدہ اور اعلیٰ ہیں اسی قدر وہ زبان و بیان کے قرینے سے بھی خوب واقف ہیں۔اس بات کی وضاحت شاہ جہاں پوری (۳۰) کس خوبصورتی سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شہزاد نیّر نے ادب کے محاذ پر اپنی فنکارانہ قابلیت و صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔شاعر تصورات کی دنیا کا سیر کار بھی ہے اور پروازِ حقائق کے افکار کا پرندہ بھی جو ہر منظرِ بسیط کو اپنے پروں میں سمیٹ لیتا ہے۔بہ ایں سبب، حقیقی شعری مکالمہ شہزاد نیّر کی نظموں اور غزلوں کو منفرز اور ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔یہ شاعر حقیقی دنیا کا باشندہ ہے جس کے اعصاب پر خیالی اور تصوراتی دنیا کی اُڑتی ہوئی دھند اثر انداز ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتی۔"

شہزاد کی شاعری کا فکری و فنی پہلوؤں سے جائزہ لینے اور ناقدین کی آراء سے جو مجموعی تاثر ابھر کر سامنے آیا ہے وہ یہی ہے کہ شہزاد فنِ شاعری سے کمال درجہ واقفیت رکھنے والے کہنہ مشق شاعر ہیں جو عہد حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق شاعری کر رہے ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اُن کی شاعری نئے ادبی رجحانات

کے ایسے امکانات کو جنم دیتی نظر آتی ہے جنہیں آنے والے ادوار میں جہانِ ادب پر منکشف ہونا ہے۔ان کا نام موجودہ دور میں بھی ملک گیر سطح پر پہچانا جاتا ہے اوران کے کام کو سراہا جاتا ہے لیکن ان کی ادبی خدمات اور ادب کے لیے ان کی محبت کو دیکھتے ہوئے وہ وقت دور نہیں جب وہ عالمگیر سطح پر سراہے جائیں گے اور پورا اردو ادب ان کے فن پر سر تسلیم خم کرے گا۔

حوالہ جات

۱۔ نیّر، نورالحسن (۲۰۰۶ء) "نور اللغات (طبع سوم)" روالپنڈی، نیلاب پرنٹرز، ص ۵۴۷

۲۔ جمال، انور (۱۹۹۸ء) "ادبی اصطلاحات" اسلام آباد، نیشنل بک فاونڈیشن، ص ۸۰

۳۔ بریلوی، عبادت (۱۹۸۹ء) "شاعری کیا ہے؟" لاہور، ادارہ ادب و تنقید، ص ۳۸

۴۔ رضوی، وقار احمد (۲۰۱۹ء) "تاریخ جدید اردو غزل" (طبع سوم) اسلام آباد، نیشنل بُک فاونڈیشن، ص ۸۷

۵۔ ہاشمی، نورالحسن (۲۰۰۶ء) "ہندوستانی ادب کے معمار ولی" دہلی، ساہتیہ اکادمی، ص ۱۷۔۱۸

۶۔ صادق، محمد (۲۰۰۹ء) "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند" (طبع دوم) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ص ۳۲۴

۷۔ نورانی، امیر حسن (۱۹۵۷ء) "تعارف۔ میر تقی میر" لکھنو، راجہ رام کمار بک ڈپو، ص ۱۶

۸۔ صدیقی، کمال احمد (۱۹۹۷ء) "غالب کی شناخت" نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۱۵

۹۔ صدیقی، رشید احمد (۱۹۵۵ء) "جدید غزل" علی گڑھ، سر سیّد بک ڈپو، ص ۱۱۵

۱۰۔ کاشمیری، حامد (۱۹۸۲) "ناصر کاظمی کی شاعری" الہ آباد، اردو راٹرس گلڈ، ص ۴۶

۱۱۔ ردولوی، شارب (۲۰۱۷ء) "اردو غزل: نئی صدی میں" مشمولہ "اکیسویں صدی میں اردو غزل" مرتب از ڈاکٹر منصور خوشتر، نئی دہلی، نیو پرنٹ سینٹر، ص ۵۶

۱۲۔ حفیظ، شیخ (۲۰۱۸ء) "محبتیں، شفقتیں" مشمولہ "خوابشار" بک کارنر، جہلم، ص ۱۵۴

۱۳۔ راؤ، ہارون (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء) "میجر شہزاد نیّر بحیثیت شاعر" مشمولہ "نورِ تحقیق" شمارہ نمبر ۱۱، لاہور، شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، ص ۳۴۰، ص ۳۴۳

۱۴۔ حسن، محمد (۱۹۵۵ء)"اردو ادب میں رومانوی تحریک "لکھنو، تنویر پریس، ص ۱۱

۱۵۔ سحر، عکاشہ (اکتوبر ۲۰۱۱ تا مارچ ۲۰۱۲ء)"چاک سے اُترے وجود، شہزاد نیّر کا مجموعہ کلام "مشمولہ "ادبِ معلیٰ" مدیر، ڈاکٹر ناصر رانا، لاہور، حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز ص ۱۵۰، ۱۷۷

۱۶۔ غلام نبی، سائرہ (اکتوبر ۲۰۰۹ء)"باتیں کتابوں کی "مشمولہ "خواتین ڈائجسٹ مدیرہ، نادرہ خاتون، کراچی، ص ۲۸۶

۱۷۔ تاج، علی بابا (مارچ ۲۰۰۷ء)" چشمِ انداز "مشمولہ "ماہنامہ جواز" مدیر، راحت ملک، کوئٹہ، ص ۳۵

۱۸۔ خان، اسد عباس (اگست ۲۰۱۰ء)" نئے انسان کا تصوف اور معرکۂ وجود "مشمولہ، ماہنامہ ادب دوست، مدیر خالد تاج، لاہور، ص ۵۵

۱۹۔ عابد، علی عابد (۱۹۹۶ء)"اسلوب "طبع دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۴۱

۲۰۔ شہزاد نیّر کی خوابشارِ ـــــــ ایک اسلوبی مطالعہ (یاسر اقبال)

M facebook,com/ story,php?story-fbid =24799860053669828 (چھ اکتوبر ۲۰۲۰ء) پانچ بجے شب

۲۱۔ بھٹی، نعیم رضا (مئی ۲۰۱۲)"خلوص وادب کا کہسار" مشمولہ ماہنامہ بیاض، شمارہ نمبر ۵ مدیر عمران منظور، خالد احمد، لاہور الائیڈ بک لمیٹڈ، ص ۱۷۶، ص ۱۷۶

۲۲۔ قریشی، ارشد (جنوری تا مارچ ۲۰۱۰)"کائناتی آدرش اور وجدانی بصیرت کا پرچاک۔۔۔ شہزاد نیّر" مشمولہ " شعر و سخن "جلد نمبر ۱۱، شمارہ ۴۱، مدیر خانِ عالم، مانسہرہ، ص ۱۸، ۲۱

۲۳۔ پ۔ا۔ن (مئی ۲۰۰۷)"برفاب کا شاعر شہزاد نیّر "مشمولہ "تارکینِ وطن" شمارہ نمبر ۴، مدیر شاہدہ فیاض حیدر، لاہور شرکت پریس۔ ص ۲۳

۲۴۔ آثم کھیازئی، محمد حسن(۱۸ ستمبر ۲۰۱۹)"میرا شاعر میرا دوست"مشمولہ روزنامہ مٹھن،راجن پور،چیف ایڈیٹر، محمد حفیظ النصیر، ص ا

۲۵۔ قاسمی احمد ندیم(۲۰۱۷)"فلیب،چاک سے اُتر روجود"از شہزاد نیّر راولپنڈی، زمیل ہاوس اَف پبلی کیشنز

۲۶۔ ناقد شبیر(جون ۲۰۱۴)"نقدِ فن"کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، ص ۱۸۳

۲۷۔ سحر، عکاشہ (نومبر ۲۰۱۲)، منزہ سہام"برفاب پر ایک تجزیاتی نوٹ"مشمولہ ماہنامہ سچی کہانیاں مدیر منزہ سہام، کراچی پرل پبلی کیشنز، ص ۲۴۴

۲۸۔ بابر راؤ احمد سجاد(۱۲اپریل ۲۰۱۲)"شہزاد نیّر دھند میں لپٹی شاعری کا خالق" مشمولہ روزنامہ خبریں، چیف ایڈیٹر ضیاشاہد، ملتان، ص ۵

۲۹۔ طریر، دانیال (ِ۲۰۱۲ء)"معاصر تھیوری اور تعینِ قدر(تحقیق و تنقید)"کوئٹہ، مہروز انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، ص ۲۰۱

۳۰۔ شاہ جہاں پوری، ساجد(۲۰۱۸ء)" محبتیں، شفقتیں"مشمولہ "خوابشار"جہلم، بک کارنر، ص ۱۵۷

ماحصل

گوجرانوالہ ایک تاریخی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے حوالے سے بھی خاصا مردم خیز خطہ رہا ہے۔اس شہر نے بہت سے نامور ادیبوں اور شعراء کو جنم دیا اور اُن کے علم و فن کی آبیاری کی۔ اس شہر نے ایسے ہزاروں اُدباومشاہیر کو پروان چڑھایا جنہوں نے اپنے علم و فن کی بدولت دنیامیں اپنانام روشن کیااور کلاسک کے درجے تک جاپہنچے۔علم وادب کے میدان میں کئی بڑے نام اس شہر سے منسوب ہیں جیسے بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر'پنڈت کالی داس'لالہ پنڈی داس'بلونت سنگھ'امرتا پریتم'مولوی انشاءاللہ خاں'ارشد میر'الطاف گوہر' رضیہ بٹ'محمد ہادی حسین' ممتاز صدیقی'مولانانصراللہ خاں عزیز' ڈاکٹروحید قریشی'جسٹس دین محمد شیخ'مظفر علی سید'عزیز لدھیانوی'محمد دین فانی'امین خیال'تنویر بخاری'،عاطف کمال رانا، حافظ محمد جھنڈا'عبدالغنی وفا اور شہزاد نیّر وغیرہ شامل ہیں۔

ماضی قریب میں جو اہم شعراء ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں ایک اہم نام شہزاد نیّر کا بھی ہے۔عصرِ حاضر میں زود گو شعراء کے جم غفیر میں اپنی ایک الگ پہچان بنانا بہت ہی مشکل کام ہے لیکن شہزاد نیّر نے یہ مشکل کام بہت آسانی سے کر لیاہے اور شہزاد شاعری کے اُفق کے روشن ستارے ہیں۔شہزاد نیّر بے پناہ تخلیقی اور عسکری قوتوں کے حامل فرد کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی عسکری قوتوں کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوتوں کی بھی آبیاری کی جبکہ عسکری قوت یا فوج سے منسلک افراد سخت قوانین میں جکڑے ہوتے ہیں، نیّر نے اپنے اندر کے تخلیق کار کو کھونے نہیں دیا۔ انہوں نے نظم اور غزل دونوں اصناف میں اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔شاعری کے علاوہ بھی شہزاد کی بہت سی ادبی خدمات ہیں اور علمی و ادبی لحاظ سے شہزاد کی شخصیت متنوع خصوصیات کی حامل ہے۔شہزاد مضمون نویسی، رپورتاژ اور لسانیات جیسے شعبوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور شاعری کے میدان میں تو ان کا کوئی حریف نہیں بلکہ ان کی شاعری پڑھ کر ایسا لگتا ہے شاعری کی دیوی ان پر خاص مہربان ہے۔ان کا کلام وارداتِ قلبی،احساساتِ روحانی اور حقیقتِ بیان جیسی خوبیوں سے لبریز ہے۔شہزاد کی شاعری جذبات و احساسات کی شاعری ہے۔ آج کے انسان کی شاعری ہے اور تخیل کے ساتھ ساتھ عقل و وجدان سے بھی

کام لینے والی محبت بھری روح کی شاعری ہے۔ شہزد کی شاعری لفظوں کی قافیہ بندی نہیں بلکہ حساس دلوں کو متوجہ کرنے والی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں دکھ ہے، درد ہے، محبت سے اور ان سب سے بڑھ کر حقیقت ہے۔

شہزاد نے شاعری کو نئے تصورات و موضوعات سے آشنا کیا ہے اور نئے ادبی اور فکری رجحانات کو متعارف کروایا ہے۔ شہزاد دونوں اصنافِ سخن نظم اور غزل کو سلیقے سے برتتے ہیں اور دونوں میں ہی انہوں نے اپنے فن کا بھرپور اظہار کیا ہے اور دونوں میں حیرت کشا تخلیقی جواہرات پیش کیے ہیں۔ شہزاد ایسے شاعر ہیں جنہوں نے تعقل پسندی اور حسن کاری کو اپنے فکری اور فنی رویوں میں جگہ دی ہے اور ایک جداگانہ اسلوب کے ساتھ ان کو سپردِ قلم کیا ہے۔ شہزاد کے جہانِ سخن میں ہمیں نت نئے پھولوں اور خوش رنگ مناظر کے ساتھ حقیقت کی سفاکی اور برہمی بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہیں وہ جنگی نقصانات سے آگاہ کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں زلزلے کے بعد کے دلخراش مناظر پر روشنی ڈالتے ہیں اور کہیں آج کے انسان کے دل کے داخلی کرب اور تنہائی کا ذکر کرتے پائے جاتے ہیں۔ شہزاد ایک حساس دل کے شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری میں اس حساسیت کا بھرپور اظہار بھی کیا ہے۔ اندازِ بیان کا اچھوتا اظہار اور فکر و فن پر مکمل دسترس جیسی خوبیاں شہزاد کو ایک بڑا شاعر تسلیم کرواتی ہیں۔ شہزاد شاعرانہ رمز سے بخوبی واقف ہیں اور ان کے کلام کے مطالعے سے قاری پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ شاعر بیان واسلوب کے تمام پیرایوں سے اچھی طرح واقف ہے اور انہیں نظم و غزل میں برتتا بھی ہے اور اس طرح قاری ان کی فنی عظمت اور شاعرانہ بصیرت کا قائل ہوتا ہے۔

شہزاد کی شاعری کی بنیاد داخلی تفکر پر ہے اور وہ تمام موضوعات کو اپنی ادراکی قوت کی بدولت بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کہیں بھی سطحی پن نہیں بلکہ گہرائی ہی گہرائی ہے۔ ان کی شاعری میں دکھ اور اداسی تو ہے مگر حالات سے مکمل طور پر مایوسی نہیں ہے بلکہ رجائیت اور امید ہے۔ شہزاد کی شاعری میں نئی لفظیات اور ترکیب سازی کی بہت سی اقسام ملتی ہیں۔ لہجے کے اعتبار سے بھی ان کا انداز بالکل منفرد اور جدا ہے۔ شہزاد جذبے اور احساس کی شدت کے ساتھ ساتھ اشعار کی ظاہری بنت کاری میں بھی کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کے مصرعوں کی ظاہری ساخت تمام عیوب سے بڑی حد تک پاک صاف ہے۔ الغرض شہزاد کا کلام صفائی و پرجستگی اور سوز و گداز کے باب میں اپنی مثال آپ ہے۔

ان کی شاعری میں پستی ذوق کی ایک بھی مثال نہیں بلکہ ہر جگہ جذبے کی تفسیر ہے اور خلوص کی فراوانی ہے۔ شہزاد کی شاعری میں تازہ کاری کے سب عناصر موجود ہیں اور نظم ہو یا غزل انہوں نے بہت انفرادیت اور سہولت سے کہی ہے کہیں بھی جبری کوشش یا مصرعوں کی کھینچا تانی ان کی شاعری کا حصہ نہیں۔ شہزاد کے کلام کی دل کی دل آویز لطافت جہاں ان کی فنی عظمت کی آئینہ دار ہے وہاں ان کی شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں کی بہترین عکاس بھی ہے اور ان کی شاعری ذوق کی بہترین تسکین کرنے کے ساتھ روح کی مرمت کرنے کا سامان بھی کرتی ہے۔ شہزاد کی شاعرانہ اپروچ بلند اور تخیل بہت اعلیٰ وارفع ہے۔

شہزاد کی شاعری میں سماج ایک اہم اور لازمی حوالہ ہے۔ سماج میں ہونے والے مظالم ان کی آنکھ سے اوجھل نہیں بلکہ ان کی نظریں خوابوں وخیالوں کی دنیا سے پڑے اس معاشرے کے واقعات وحالات پر گڑی ہوئی ہیں اور انہوں نے سماج کے مسائل، مشکلات، فرد کے احساسات اور داخلی کرب کو پوری سچائی اور گہرائی سے بیان کیا ہے۔ شہزاد کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز اور گہری ہے۔ وہ معاشرے میں غریبوں پر ڈھائے جانے والے مظام پر نوحہ کناں ہیں۔ شہزاد کی شاعری کا ایک ایک لفظ ان کی انسانیت کے لیے ہمدردی اور جانبداری کو بیان کرتا ہے۔ وہ جب معاشرے میں جاری جنگ و جدل اور بے اعتدالی کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر کا شاعر بے چین ہو جاتا ہے اور وہ اپنے احساسات وجذبات کو اور اپنے اندر کے غم وغصہ کا علامتوں اور کنائیوں میں اظہار کر دیتے ہیں اور یوں شہزاد کی شاعری بنی نوع انسان کا نوحہ قرار پاتی ہے۔ الغرض شہزاد ایک عہد آفریں شاعر ہیں جن کا قلم اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی رجحانات کو متاثر کرنے کا ہنر رکھتا ہے۔

کتابیات:

بنیادی ماخذ (کتب):

نیّر، شہزاد (۲۰۰۶ء) "برفاب" لاہور، سانجھ پبلی کیشن

نیّر، شہزاد (۲۰۰۹ء) "چاک سے اُترے وجود" روالپنڈی، زمیل ہاؤس آف پبلی کیشن

نیّر، شہزاد (۲۰۱۳ء) "گرہ کھلنے تک"، جہلم، بک کارنر

نیّر، شہزاد (۲۰۱۸ء) "خوابشار" جہلم، بک کارنر

ثانوی ماخذ (کتب):

ابن خلدون، عبدالرحمن (۲۰۰۱) "مقدمہ ابن خلدون" کراچی، نفیس آکیڈمی

احمد' آفتاب (۱۹۸۶ء) "شاعروں کا شاعر ــــ راشد" مشمولہ ن۔م۔ راشد۔ ایک مطالعہ" مرتبہ "جمیل جالبی" کراچی، مکتبہ اسلوب

اختر، سلیم (۱۹۹۳ء) "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" پندرہواں ایڈیشن، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز

آغا، وزیر (۱۹۶۸) "تنقید و احتساب" لاہور، جدید ناشران

آغا، وزیر (۱۹۹۵) "اردو شاعری کا مزاج" لاہور، جدید ناشران

آغا، وزیر (۲۰۱۸ء) "نظم جدید کی کروٹیں، لاہور، سنگت پبلشرز

باقر، آغا محمد (۱۹۳۲ء) "تاریخِ نظم و نثر اردو" لاہور، عالمگیر الیکٹرک پریس

بریلوی، عبادت (۱۹۸۹ء) "شاعری کیا ہے؟" لاہور، ادارہ ادب و تنقید

جاوید، یونس (۱۹۸۴ء) "حلقۂ اربابِ ذوق" لاہور، مجلس ترقی ادب

جعفری، اختر حسین (۱۹۹۳ء) "جہاں دریا اُترتا ہے"، لاہور، فرواپبلشنگ ہاوس

جمال، انور (۱۹۹۸) "ادبی اصطلاحات" اسلام آباد، نیشنل بُک فاونڈیشن

حالی، الطاف حسین (۲۰۰۱) "مقدمہ شعر و شاعری" لاہور، خزینہ علم و ادب

حسن، محمد (۱۹۵۵ء) "اردو ادب میں رومانوی تحریک" لکھنو، تنویر پریس

ردولوی، شارب (۲۰۱۷ء) "اردو غزل: نئی صدی میں" مشمولہ "اکیسویں صدی میں اردو غزل" مرتب از ڈاکٹر منصور خوشتر، نئی دہلی، نیو پرنٹ سینٹر

رضوی، وقار احمد (۲۰۱۹ء) "تاریخ جدید اردو غزل" (طبع سوم) اسلام آباد، نیشنل بُک فاونڈیشن

زکریا، خواجہ محمد (۲۰۱۲ء) "تاریخ ادبیات" لاہور، پنجاب یونیورسٹی

زیدی، نظیر حسنین (۱۹۸۶) "مولانا ظفر علی خاں—احوال و آثار" لاہور، مجلس ترقی ادب

ساحر، عبد العزیز (۲۰۰۷ء) "ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن" اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان

سرور، آل احمد (س ن) "انتخاب آل احمد سرور" مرتبہ، فقیر احمد فیصل، لاہور، لاہور اکیڈمی

سیّد، عبد اللہ (فروری ۱۹۶۵ء) "مباحث" لاہور، مجلسِ ترقی ادب

سروری، عبد القادر (۱۹۳۲ء) "جدید اردو شاعری" حیدر آباد، انجمن ترقی اُردو ہند

سعید، سعادت (جولائی ۱۹۹۰ء) "جدید اظہار اور منزلِ شب" مشمولہ "مقالات حلقۂ اربابِ ذوق" مرتبہ سہیل احمد، لاہور، پولی مر پبلی کیشنز

شیخ، اسد سلیم (۲۰۱۶) "نگر نگر پنجاب" لاہور، فکشن ہاؤس

صدیقی، رشید احمد (۱۹۵۵ء) "جدید غزل" علی گڑھ، سر سیّد بک ڈپو

صدیقی، کمال احمد (۱۹۹۷ء) "غالب کی شناخت" نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ

صدیقی، ادریس (۱۹۷۹ء) "اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ" کراچی، سرسید بک کمپنی

صدیقی، مختار (۱۹۵۵ء) "منزلِ شب" لاہور، مکتبہ نیا ادارہ

طریر، دانیال (۲۰۱۲ء) "معاصر تھیوری اور تعینِ قدر (تحقیق و تنقید)" کوئٹہ، مہرو زانسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن

ظفر، یوسف (۱۹۴۴ء) "زہر خند" لاہور، مکتبہ اردو

عابد، علی عابد (۱۹۹۶ء) "اسلوب" طبع دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب

عبدالحکیم، خلیفہ (جون ۱۹۶۸ء) "فکرِ اقبال" لاہور، بزمِ اقبال

علوی، ایم اے (س ن د) "جغرافیہ پاکستان" کراچی، الائیز بک کارپوریشن

علیم، شاداب (۲۰۱۰ء) "جدید شاعری کا نقطہ آغاز: اسماعیل میرٹھی" دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس

قاضی، محمود احمد (۲۰۱۵ء) "یہ کوجرانوالہ ہے" لاہور 'جمہوری پبلی کیشنز

قریشی، وحید (۱۹۸۱ء) "الواح" فیصل آباد، طور پرنٹنگ پریس

کاشمیری، عارف (۱۹۸۷ء) "اعراف" گوجرانوالہ، مکتبہ قرطاس

کاشمیری، حامد (۱۹۸۲) "ناصر کاظمی کی شاعری" الہ آباد، اُردو رائٹرس گلڈ

مقدر، عبدالقدیر (۲۰۰۶ء) "راجہ مہدی علی خاں کی ادبی خدمات" نظام آباد، اندور آفسٹ پرنٹرس پھولانگ

ملک، فتح محمد (۱۹۵۵ء) "تحسین و تردید" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز

ناقد شبیر (جون ۲۰۱۴) "نقدِ فن" کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز

نقوی، سید طلعت حسین (۱۹۹۱ء) "نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری" دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس

نقوی، سید طلعت حسین (۱۹۹۰ء) "نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ "فیض آباد، نشاط آفسٹ پریس

نگار، سنبل (۲۰۱۹ء) "اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ "لاہور، فکشن ہاوس

نورانی، امیر حسن (۱۹۵۷ء) "تعارف۔ میر تقی میر" لکھنو، راجہ رام کمار بک ڈپو

ہاشمی، نور الحسن (۲۰۰۶ء) "ہندوستانی ادب کے معمار ولی" دہلی، ساہتیہ اکادمی

رسائل و جرائد:

ادب دوست (اگست ۲۰۱۰ء) مدیر خالد تاج، لاہور

ادبِ لطیف (جولائی ۲۰۱۵) مدیر ناصر زیدی، لاہور

ادبِ معلیٰ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء و جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء) مدیر ڈاکٹر ناصر رانا، لاہور، حنیف اینڈ سنز پرنٹرز

ادراک (اگست ۲۰۰۵ء تا اپریل ۲۰۰۶ء) مدیران، خالد فتح محمد، اسد ملک، گوجرانوالہ

ارژنگ (جنوری ۲۰۲۱ء) مدیر حسن عباسی، لاہور، راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

انتقادات حصہ اول و دوم (دسمبر ۱۹۹۵ء) "۴۷واں سال، شمارہ ۱۲

الحمراء (نومبر ۲۰۰۷ء) مدیر شاہد علی خاں، لاہور

بابِ دعا آن لائن میگزین (ستمبر ۲۰۱۹ء)، مدیرہ دعا علی

بنیاد (۲۰۱۰ء) مدیران یاسمین حمید، معین نظامی، لاہور، گورمانی مرکز زبان و ادب لمز یونیورسٹی

بیاض (اپریل ۲۰۲۰ء)، مدیر عمران منظور، لاہور، الائیڈ بک لمیٹڈ

بیاض (مئی ۲۰۱۲) شمارہ نمبر ۵، مدیران عمران منظور، خالد احمد، لاہور، الائیڈ بک لمیٹڈ

تارکینِ وطن (مئی ۲۰۰۷) شمارہ نمبر ۴، مدیر شاہدہ فیاض حیدر، لاہور، شرکت پریس

جواز (مارچ ۲۰۰۷ء) مدیر راحت ملک، کوئٹہ

چہار سو (جنوری، فروری ۲۰۰۷ء) جلد نمبر ۱۴، مدیر سید ضمیر جعفری، روالپنڈی، فیض اسلام پرنٹنگ پریس

خواتین ڈائجسٹ (اکتوبر ۲۰۰۹ء) مدیرہ، نادرہ خاتون، کراچی شعر و سخن (جنوری تا مارچ ۲۰۱۰) جلد نمبر ۱۱، شمارہ ۴۱، مدیر خانِ عالم، مانسہرہ

روزنامہ بارڈر لائن (۲۹ اکتوبر ۲۰۱۹ء) جلد نمبر ۲۲، شمارہ ۲۵۱، چیف ایڈیٹر، نواب ناظم میو، لاہور

روزنامہ خبریں (۱۲ اپریل ۲۰۱۲) چیف ایڈیٹر ضیا شاہد، ملتان

روزنامہ مِٹھن (۱۸ ستمبر ۲۰۱۹)، چیف ایڈیٹر، محمد حفیظ النصیر، راجن پور

زر نگار (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۹ء) مدیر علامہ ضیاء حسین ضیا، فیصل آباد، کراچی، پیراگون بک فاؤنڈیشن

سچی کہانیاں (نومبر ۲۰۱۲)، مدیر منزہ سہام، کراچی، پرل پبلی کیشنز

شعر و سخن (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵) مدیر جانِ عالم، مانسہرہ

صحیفہ (اپریل تا جون ۲۰۰۲ء) لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب

فن زاد (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء) مدیر یوسف چوہان، بھیرہ،

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ (اکتوبر ۲۰۰۹ء) مدیرہ نادرہ خاتون، کراچی

مونتاج سہ ماہی (جنوری تا اپریل ۲۰۰۷ء) مدیرہ منصورہ احمد، لاہور

مونتاج (اپریل تا جون ۲۰۰۸ء) مدیرہ منصورہ احمد، لاہور

نورِ تحقیق (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء) شمارہ نمبر ۱۱، لاہور، شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی

انٹرویوز:

نیّر، شہزاد (اگست ۲۰۱۹) "سوچ کے نرالے ڈھنگ" جہلم، بک کارنر

احد، عائشہ (مصاحبہ) سوالات از حفصہ طاہرہ، لاہور، ۴ ستمبر ۲۰۲۰

سیما، شہزاد (مصاحبہ) سوالات از حفصہ طاہرہ، لاہور، ۴ ستمبر ۲۰۲۰

نیّر، شہزاد (انٹرویو) "دی لالٹین The LAALTAIN" (سرما ۲۰۱۲) ایڈیٹر رب نواز، لاہور، احسن ذکاء پرنٹرز

نیّر، شہزاد (جون ۲۰۲۰) "کامیابی کے لیے نمبر نہیں کافی" لاہور، نئی سوچ پبلشرز

نیّر، شہزاد (مصاحبہ) "میجر شہزاد نیّر سے خصوصی ملاقات" مشمولہ "روزنامہ حرمت" لاہور، ۱۱ اپریل ۲۰۱۹

نیّر، شہزاد (مصاحبہ) سوالات از حافظ امین نفیس، مشمولہ "روزنامہ پوسٹ مارٹم" چیف ایڈیٹر "ذبیح اللہ ہلکن" گوجرانوالہ، ۲۲ اپریل ۲۰۲۰،

نیّر، شہزاد انٹرویو سوالات از شاہین رشید مشمولہ "ماہنامہ کرن" (مارچ ۲۰۱۸ء) جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۱۲، مدیرہ نادرہ خاتون، کراچی، ابن حسن پرنٹنگ پریس

نیّر، شہزاد انٹرویو مشمولہ "قلم کی روشنی" شمارہ (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۸) مولف اعلیٰ "محمود ظفر اقبال ہاشمی

نیّر، شہزاد (انٹرویو) "آپ کے روبرو" مشمولہ "ماہنامہ ریشم" شمارہ ۱۱، جلد نمبر ۱۶، جولائی ۲۰۱۶

نیّر، شہزاد (انٹرویو) "شہزاد نیّر سے ایک ملاقات" سوالات از آصف اے شیخ، ابو سلیمان، مشمولہ "پارہ چنّار" شمارہ نمبر ۸

نیّر، شہزاد (انٹرویو) "منفرد لب و لہجے کے شاعر۔۔۔ محقق، نقاد شہزاد نیّر سے خصوصی گفتگو" سوالات از شاہدہ مجید، مشمولہ "انصاف" سنڈے میگزین ۲۸ جنوری ۲۰۱۸

نیّر،شہزاد(انٹرویو)سوالات از صفیہ کوثر مشمولہ وقار النساء کالج میگزین (۲۰۱۷-۲۰۱۸)روالپنڈی،پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین

نیّر،شہزاد(مصاحبہ)سوالات از حفصہ طاہرہ،لاہور ۱۰ جنوری ۲۰۲۱

نیّر،شہزاد(مصاحبہ)سوالات از حفصہ طاہرہ،لاہور،۴ ستمبر ۲۰۲۰

نیّر،شہزاد(مصاحبہ)سوالات از راجہ مدثر مشمولہ "روزنامہ ایکسپریس"اسلام آباد،۱۴ جنوری ۲۰۱۶

نیّر،شہزاد،انٹرویو"روزنامہ حرمت"سوالات از ڈاکٹر چوہدری تنویر سردار،لاہور،جمعرات،۱۱ اپریل ۲۰۱۹

ہفت روزہ مارگلہ نیوز(۱۵ اکتوبر ۲۰۲۰ء)مدیر توقیر کھرل،اسلام آباد

لغات:

دہلوی'سید احمد(۲۰۱۰)"فرہنگ آصفیہ "جلد اول،طبع عکسی(بار ششم)'لاہور،کوثر پرنٹنگ کارپوریشن

نیّر،نورالحسن(۲۰۰۶ء)"نور اللغات(طبع سوم)"روالپنڈی،نیلاب پرنٹرز

ویب سائٹ:

M facebook,com/story,php?story-fbid =24799860053669828(چھ اکتوبر ۲۰۲۰ء)
پانچ بجے شب